انتخاب تہذیب الاخلاق

انتخاب از تہذیب الاخلاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمدردی

ہر کوئی اپنی آپ ہمدردی کرتا ہے

کیا دھوکے کی چیز ہے۔ کیا بھلاوے میں پڑے ہیں۔ جو سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی مصیبت میں مدد کرنا ہمدردی کرنا ہے۔ کیا قدرت کا کوئی کام بیفائدہ ہے؟ نہیں۔ گو ہم بہتوں کے سمجھنے سے عاجز ہیں کیا ہم اس فائدے میں شریک نہیں ہیں؟ نہیں۔ بے شک واسطہ یا بلا واسطہ یا واسطہ در واسطہ شریک ہیں۔ پھر دوسرے کی مدد کرنا کہاں رہا۔ بلکہ اپنی آسائش کے کسی وسیلہ سے اپنی آپ مدد کرنا ہوا۔ اس لئے جو لوگ ہمدردی کرتے ہیں وہ حقیقت میں اپنی آپ مدد کرتے ہیں اور جو نہیں کرتے وہ خود اپنی آسائش کے وسیلہ کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

ہمدردی کا لفظ ہمارے خیال کو ایسی امداد کی طرف لے جاتا ہے جو رنج و مصیبت کی حالت میں ہو لیکن اگر ہم مصیبت کے لفظ کی

اصلی مراد پر غور نہ کریں تو ضرور غلطی میں پڑیں۔
عام مفہوم مصیبت کا جو اس لفظ سے ہماری سمجھ میں آتا ہے کوئی مستقل مفہوم نہیں ہے بلکہ ایک نسبتی مفہوم معلوم ہوتا ہے۔ جو چیز کہ ایک کے لئے مصیبت ہو ممکن ہے کہ دوسرے کے لئے نہ ہو۔ وہ عادت اور استعمال سے ایسی مختلف ہو جاتی ہے کہ مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔ وہ کسی جوش کے سبب سے ایسی بدل جاتی ہے کہ بالکل راحت سمجھ میں آتی ہے۔ بے شک یہ تمام مفہوم نسبتی ہیں اور جو اصلی مفہوم ہے وہ ایسی حالت کا ہونا یا واقع ہونا ہے جو قدرتی فرحت اور راحت کے برخلاف ہو۔

اس حالت کا ہونا غیر اختیاری حالتوں کا ہونا ہے اور واقع ہونا اختیاری حالتوں کا۔ مگر پچھلی حالت اگر نتیجہ کی لاعلمی یا نقصانات غیر متعدی کے سبب سے ہے تو مجازاً وہ پہلی ہی سی ہے ورنہ حقیقت میں وہ مصیبت نہیں بلکہ سزا ہے اور اس لئے اس میں ہمدردی نہیں پس اصلی یا اصلی سی مصیبت میں کسی کی مدد کرنا البتہ سچی ہمدردی ہے۔

رحم اور موانست اور ہمدردی شاید نتیجہ میں متحد ہوں مگر ہر ایک کا منشاء مختلف ہے۔ رحم ایک فطرتی نیکی ہے جو ہمجنس اور غیر ہمجنس دونوں کے ساتھ برتی جاتی ہے۔ موانست کا اثر صرف ہمجنسوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ ہمدردی جو عقل کے نتیجوں میں سے ہے ذی عقل ہی میں ہو سکتی ہے اور اس لئے صرف انسان ہی میں منحصر ہے۔ پس جس میں ہمدردی نہیں

اُس کی انسانیت میں نقصان ہے۔

قدرتی قاعدے کے مطابق ہمدردی کے بقدر تفاوت اپنی آسائش کے وسیلوں کے متفاوت درجے ہیں۔ جس طرح کہ باپ۔ بھائی۔ جورو بچے پھر اور درجہ بدرجہ کے رشتہ مند۔ پھر اپنے مُلک کے۔ پھر اپنے ہمسایہ مُلک کے۔ پھر اس سے دور کے ملک کے باشندے درجہ بدرجہ ہماری آسائش کے وسیلے ہیں۔ اسی طرح اُس قادر مطلق کی کامل قدرت نے ہمدردی کے رشتہ کی مضبوطی اور استواری کو بھی درجہ بدرجہ بنایا ہے باپ کو بیٹے سے جو جوش ہمدردی ہے وہ پوتے سے نہیں۔ اور جو پوتے سے ہے وہ پڑپوتے سے نہیں۔ اسی طرح یہ رشتہ جتنا کہ بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی گھٹتا جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے ملک یا اپنے ہمسایہ مُلک یا اُس سے دور کے مُلک تک پہنچتا ہے تو اور بھی پتلا ہو جاتا ہے۔

بعضے کہتے ہیں کہ "یہ ایک دھوکہ ہے اور اگر یہ دھوکہ نہیں ہے اور یہ متفاوت درجے قدرتی ہیں تو انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں کیوں وہ ہمدردی نہیں۔ حقیقت میں یہ صرف ایک خیال ہے جس سے سوالنست پیدا ہوتی ہے اور وہی باعث ہمدردی ہے۔ نفرت جو اُس کی ضد ہے اس کا بخوبی ثبوت کرتی ہے کہ جب وہ پیدا ہوتی ہے تو باوجود موجود ہونے قدرتی رشتہ کے کچھ بھی ہمدردی نہیں رہتی"۔

بے شک ایسا یا ایسا سا ہوتا ہے مگر اس میں کچھ غلطی بھی ہے قریب رشتہ والا بہ نسبت دور کے رشتہ والے کے بلا شبہ ہم سے

زیادہ تر جزئیت رکھتا ہے اور اسی طرح بعید بہ نسبت ابعد کے؛ پھر اگر
وہ جزئیت قدرتی ہے تو وہ ہمدردی بھی قدرتی ہے۔ ہاں سوا انست اس کو
نہایت تیز کر دیتی ہے؛ اور کبھی ایسی جو قدرتی سی معلوم ہوتی ہے نفرت
اُس کی تیزی کو دباتی ہے اور کبھی ایسا کر دیتی ہے جو کبھی ہوئی سی معلوم
ہوتی ہے۔ انجان بیٹے اور ان پہچان باپ میں جو وہ جھلکتی نہیں نہ اس لئے
کہ وہ نہیں ہے بلکہ اس لئے کہ اُن میں انسانیت کا ایک بڑا جزو جو علم
یعنی دانستن ہے وہ نہیں ہے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ جو ہمدردی اعلیٰ ہے
وہ مذہب میں اعلےٰ اور صفت میں ادنےٰ ہے اور جو ادنےٰ ہے۔ وہ مذہب
میں ادنےٰ اور صفت میں اعلےٰ ہے۔ اس لئے کہ ایک میں کھونا قدرتی صفت
کا اور دوسری میں متصف ہونا قدرتی صفت میں ہے۔

قریبوں سے ہمدردی نہ کرنی نہایت بدخصلت قابل سزا کے ہے
اس لئے کہ قدرت کے نہایت مستحکم قاعدے کو توڑنا ہے اور کرنی کچھ
بڑی صفت نہیں؛ کیونکہ قدرت نے اُس کے کرنے پر مجبور کر رکھا ہے
بعیدوں سے ویسی نہ کرنی کچھ سخت مذمت نہیں اس لئے کہ قدرت
کے کسی مستحکم قاعدہ کی برخلافی نہیں اور کرنی نہایت عمدہ صفت ہے
کیونکہ قدرت کے منشاء کو بدرجۂ اتم کامل کرنا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ عمدہ صفت کبھی دھوکہ کھا کر معیوب بھی کر دی
جاتی ہے جبکہ پہلی کو ادنیٰ صفت سمجھ کر چھوڑتے ہیں اور دوسری کو اعلےٰ
صفت سمجھ کر پکڑتے ہیں۔ مگر پہلی کے چھوڑنے کی برائی دوسری کی

بھلائی کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ پس سچی ہمدردی وہی ہے جو قدرت کے قانون کے مطابق اور قدرت کے منشاء کی تکمیل کے لئے ہو۔

کیا عمدہ اور سہل طور پر تمام عملدرآمد کے لائق کر دیا ہے۔ اس مضمون کو بڑی قدرت والے اور معاشرت و تمدّن کے زبردست قانون جاننے والے نے جبکہ ہم سے یوں کہا۔ لیس البرّ[1] ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البرّ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر والملٰئکۃ والکتاب والنبیین واٰتی المال علیٰ حبّہٖ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السّبیل والسّائلین وفی الرّقاب“

جو عمدہ ترتیب ہمدردی کی اس میں بتائی ہے وہ بالکل قانون قدرت کے مطابق ہے جس سے یقین ہوتا ہے کہ جس نے قدرت کے قانون کو بنایا ہے اُسی نے یہ عملی قانون ہم کو دیا ہے۔ بے شک دونوں کا بانی ایک ہی ہے جس کے فعل اور قول دونوں کا ایک ہی مقصد ہے۔

رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات

(سرسید)

ہم اپنے اس آرٹیکل کو بعض بڑے بڑے حکیموں کی تحریروں سے اخذ کر کے لکھتے ہیں۔ کیا عمدہ قول ایک بڑے دانا کا ہے کہ ”انسان کی زندگی کا

---

[1] نیکی یہی نہیں کہ منہ کرو اپنے مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف لیکن نیکی وہ ہے جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور کتاب پر اور دیوے مال اُس کی محبت پر قرابت والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور راہ کے مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں

منشاء یہ ہے کہ اُس کے تمام قوتے اور جذبات نہایت روشن اور شگفتہ ہوں اور اُن میں باہم نامناسبت اور تناقض واقع نہ ہو بلکہ سب کا مِلکر ایک کامل اور نہایت متناسب مجموعہ ہو" مگر جس قوم میں کہ پُرانی رسم ورواج کی پابندی ہوتی ہے یعنی اُن رسموں پر نہ چلنے والا مطعون اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔ وہاں زندگی کا منشاء معلوم ہو جاتا ہے۔

ایک اور بڑے دانا شخص کی رائے کا یہ نتیجہ ہے کہ آزادی اور اپنی خوشی پر چلنا جہاں تک کہ دوسروں کو ضرر نہ پہنچے ہر انسان کی خوشی اور اُس کا حق ہے۔ پس جہاں کہیں معاشرت کا قاعدہ جس کا کوئی چلتا ہے خاص اُسی کی خصلت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اگلی روایتوں پر یا پُرانی رسم ورواج پر مبنی ہے تو وہاں انسانوں کی خوشحالی کا ایک بڑا جزو موجود نہیں ہے اور جو کہ خوشحالی ہر فرد بشر کی اور نیز کُل لوگوں کی ترقی کا بہت بڑا جزو ہے تو اُس ملک میں جہاں رسموں کی پابندی ہے وہ جزو بھی ناپید ہوتا ہے۔ کسی شخص کی یہ رائے نہ ہوگی کہ آدمیوں کو بجز ایک دوسرے کی تقلید کے اور کچھ مُطلق نہ کرنا چاہیے اور نہ کوئی شخص یہ کہے گا کہ آدمیوں کو اپنی اوقات بسری کے طریقے اور اپنے کاروبار کی کارروائی میں اپنی خوشی اور اپنی رائے کے مطابق کوئی بات بھی کرنی نہ چاہیے۔ سیدھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو اُس کی جوانی میں اس طرح سے تعلیم ہونی چاہیے کہ اور لوگوں کے تجربوں سے جو نتیجے تحقیق ہو چکے ہیں اُن کے فوائد سے مستفید ہو اور پھر جب اُس کی عقل پختگی پر پہنچے تو خود اُن کی

بھلائی اور بُرائی کو جانچے۔

بے سوچے اور بے سمجھے رسومات کی پابندی کرنے سے گو وہ رسمیں اچھی ہی کیوں نہ ہوں آدمی کی اُن صفتوں کی ترقی اور شگفتگی نہیں ہوتی جو خدائے تعالےٰ نے ہر آدمی کو جُدا جُدا عنایت کی ہیں۔ اُن قوتوں کا برتاؤ جو کسی چیز کی بھلائی بُرائی دریافت کرنے اور کسی بات پر رائے دینے اور دو باتوں میں امتیاز کرنے اور عقل و فہم کو تیز رکھنے بلکہ اخلاقی باتوں کی بھلائی اور بُرائی تجویز کرنے میں مستعمل ہوتی ہیں صرف ایسی ہی صورت میں ممکن ہے جبکہ ہم کو ہر بات کے پسند یا ناپسند کرنے کا اختیار حاصل ہو۔ جو شخص کوئی بات رسم کی پابندی سے اختیار کرتا ہے وہ شخص اُس بات کو پسند یا ناپسند نہیں کرتا اور نہ ایسے شخص کو اُس بات کی تمیز یا خواہش میں کچھ تجربہ حاصل ہوتا ہے۔ اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اُس صورت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ استعمال میں لائی جاویں اُن قوتوں کو اَوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص کے لئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندریں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔

البتہ جو شخص اپنا طریقہ خود پسند کرتا ہے وہ اپنی تمام قوتوں سے کام لیتا ہے زمانۂ حال پر نظر کرنے کے لئے اُس کو قوت تحقیق درکار ہوتی ہے اور انجام کار پر غور کرنے کے لئے قوت تجویز اور اُس کا تصفیہ کرنے کو قوت استقرار اور بھلا بُرا ٹھہرانے کو قوت امتیاز اور سب

باتوں کے تصفیہ کے بعد اُس پر قائم رہنے کے لئے قوت استقلال؛
اور یہی سب کام ہیں جو انسان کے کرنے کے لائق ہیں آدمی مثل ایک
کل کے نہیں ہے کہ جو اُس کے واسطے مقرر کردیا ہے اُسی کو انجام دیا
کرے؛ بلکہ وہ ایک ایسا درخت ہے جو اُن اندرونی قوتوں سے جو
خدا نے اُس میں رکھی ہیں اور جن کے سبب سے وہ زندہ مخلوق
کہلاتا ہے ہر چہار طرف پھیلے اور بڑھے۔ پھوٗلے اور پھلے۔
جو امر کہ پسندیدہ اور تسلیم کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنے
فہم اور اپنی عقل سے کام لیں اور رسم و رواج کی پابندی بھی ایک
معقول طور پر رکھیں یعنی جو عمدہ و مفید ہیں اُن کو اختیار کریں جو قابل
اصلاح ہوں اُن میں ترمیم کریں اور جو بُری اور خراب ہوں اُن کی
پابندی چھوڑ دیں نہ یہ کہ اندھوں کی طرح یا ایک کل کی مانند ہمیشہ اُسی
سے پٹے رہیں۔
یہ بات خیال کی جاتی ہے کہ رسومات کی پابندی نہ کرنے سے
آدمی خراب کاموں اور بُری باتوں میں مُبتلا ہوجاتا ہے۔ مگر یہ بات
صحیح نہیں ہے اِس لئے کہ انسان کی ذات میں جیسے کہ خراب کام
کرنے کی قوتیں اور جذبے ہیں ویسے ہی اُن کے روکنے کی بھی قوتیں
اور جذبے ہیں۔ مثلاً ایمان یا نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے۔ پس
خراب کام ہونے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس نے رسومات کی پابندی
نہیں کی بلکہ یہ باعث ہے کہ اُس نے ایک قسم کی قوتوں اور جذبوں

شگفتہ اور شاداب اور قوی کرتا ہے۔ اور دوسری قسم کی قوتوں اور جذبوں کو پژمردہ اور ضعیف۔ اگر رسومات کی پابندی نہ رکھنے کے ساتھ انسان کا ایمان ضعیف نہ ہو یا وہ دلی نیکی جو ہر انسان کے دل میں ہے پژمردہ نہ ہو تو بجز عمدہ اور پسندیدہ باتوں کے اور کسی بات کا ارتکاب نہ ہو۔

ہمارے زمانہ میں ہر شخص اعلےٰ سے لیکر ادنےٰ تک رسم و رواج کا ایسا پابند ہے جیسے کوئی شخص ایک بڑے زبردست حاکم کے نیچے اپنی زندگی بسر کرتا ہو۔ کوئی شخص یا کوئی خاندان اپنے دل سے یہ بات نہیں پوچھتا کہ ہم کو کیا کرنا چاہئے اور ہمارے مناسب یا ہماری پسند اور ہماری پسند کے لائق کیا بات ہے یا جو عمدہ صفتیں مجھ میں ہیں اُن کا ظہور نہایت عمدگی سے کس طرح ممکن ہے اور کونسی بات اُن کی ترقی اور شگفتگی کی معاون ہے بلکہ وہ اپنے دل سے یہ پوچھتے ہیں کہ میری حالت اور رُتبہ کے کونسی چیز مناسب ہے میرے رتبہ اور مقدور کے آدمی کس رسم و رواج کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس سے بھی زیادہ بیوقوف ہوا تو وہ اپنے دل سے اس سے بھی زیادہ بدتر سوال کرتا ہے اور یوں پوچھتا ہے کہ جو لوگ مجھ سے بہتر ہیں اور رُتبہ اور مقدور میں زیادہ ہیں وہ کن رسموں کو بجا لاتے ہیں تاکہ یہ شخص بھی ویسا ہی کرکے اُنہی کی سی شان میں شامل ہو۔

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جو لوگ اسی طرح بد رسومات کی

بجا لاتے ہیں وہ اپنی خواہش اور مرضی سے اُن رسومات کو اور چیزوں پر
ترجیح دیتے ہیں اور ترجیح دیکر پسند کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ
اُن لوگوں کو بجز ایسی بات کے جو رسمی ہوتی ہے اور کسی بات کی خواہش
کرنے کا موقع یا اتفاق نہیں ہوتا اور اس لئے طبیعت خود متحمل اور مطیع
رسموں کی پابندی کی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ جو باتیں دل کی خوشی کی کرنی
ہوتی ہیں اُن میں بھی اوروں کے مطابق کام کرنے کا خیال اوّل دل میں
آتا ہے۔ غرض کہ اُن کی پسند وُہی ہوتی ہے جو بہت سے لوگوں کی ہے
وہ صرف ایسی باتوں کے پسند کرنے پر راغب ہوتے ہیں جو عام پسند ہوں
اور مذاق اور اصلی سلیقہ جو رسم و رواج کے مطابق نہ ہو اُس سے ایسی ہی
گریز کی جاتی ہے جیسے کہ جرموں سے یہاں تک کہ اپنی خاص طبیعت کی
پیروی نہ کرتے کرتے اُن میں اپنی طبیعت ہی باقی نہیں رہتی کہ جس کی
پیروی کریں اور اُن کی ذاتی قوتیں بالکل پژمردہ اور بیکار رہنے کے سبب
بالکلیہ ضایع ہو جاتی ہیں اور وہ شخص اپنی دلی خواہش کرنے اور ذاتی خوشی
اُٹھانے کے قابل نہیں رہتے اور عموماً ایسی طبع اور رائیں یا خیالات نہیں
رکھتے جو خاص اُن کی اصلی خوشی سے مخصوص ہوں اب غور کرنا چاہئے کہ
انسان کی ایسی حالت پسندیدہ ہو سکتی ہے یا نہیں۔

رسومات جو مقرر ہوئی ہیں غالباً اُس زمانہ میں جبکہ وہ مقرر ہوئیں مفید
تصور کی گئی ہوں مگر اس بات پر بھروسہ کرنا کہ درحقیقت وہ ایسی ہی ہیں
محض غلطی ہے۔ ممکن ہے کہ جن لوگوں نے اُن کو مقرر کیا اُن کی رائیں

غلطی ہو اُن کا تجربہ صحیح نہ ہو یا اُن کا تجربہ نہایت محدود اور صرف چند اشخاص سے متعلق ہو یا اُس تجربہ کا حال صحیح صحیح بیان نہ ہوا ہو۔ یا وہ رسم اُس وقت اور اس زمانہ میں مفید ہو الّا حال کے زمانہ میں مفید نہ رہی ہو بلکہ مضر ہو یا وہ رسم جن حالات پر قائم کی گئی تھی کسی شخص کی وہ حالت نہ ہو غرض کہ رسموں کی پابندی میں مبتلا رہنا ہر طرح پر نقصان کا باعث ہے اگر کوئی نقصان نہ ہو تو یہ نقصان تو ضرور ہے کہ آدمی کی عقل اور دانش اور جودتِ طبع اور قوت ایجاد باطل ہو جاتی ہے

یہ بات بے شک ہے کہ کسی عُمدہ بات کی ایجاد کی لیاقت ہر ایک شخص کو نہیں ہوتی بلکہ چند دانا شخصوں کو ہوتی ہے جن کی پیروی اور سب لوگ کرتے ہیں لیکن رسم کی پابندی اور اس قسم کی پیروی میں بہت بڑا فرق ہے۔ رسومات کی پابندی میں اُس کی بھلائی و بُرائی و مفید و غیر مفید و مناسب حال و مطابق طبع ہونے یا نہ ہونے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا اور بغیر سوچے سمجھے اُس کی پابندی کی جاتی ہے اور دوسری حالت میں بوجہ پسندیدہ ہونے کے۔ اور اس لئے دوسری حالت میں جو قوتیں ترقی کی انسان میں ہیں وہ معدوم و مفقود نہیں ہوتیں الّا پہلی حالت میں معدوم و نابود ہو جاتی ہیں۔

رسم کی پابندی ہر جگہ انسان کی ترقی کی مانع و مزاحم ہے چنانچہ وہ پابندی ایسی قوت طبعی کے جس کے ذریعے بہ نسبت معمولی باتوں کے کوئی بہتر بات کرنے کا قصد کیا جاوے برابر مخالف رہتی ہے

اور انسان کی تنزلی حالت کا اصلی باعث ہوئی ہے۔

اب اس رائے کو دُنیا کی موجود قوموں کے حال سے مقابلہ کرو۔ تمام مشرقی یا ایشیائی مُلکوں کا حال دیکھو کہ اُن مُلکوں میں تمام باتوں کے تصفیہ کا مدار رسم و رواج پر ہے۔ اُن مُلکوں میں مذہب اور استحقاق اور انصاف کے لفظوں سے رسموں کی پابندی مراد ہوتی ہے۔ پس اب دیکھ لو کہ مشرقی یا ایشیائی قوموں کا جن میں مسلمان بھی داخل ہیں کیسا ابتر اور خراب اور ذلیل حال ہے۔ ان مشرقی یا ایشیائی قوموں میں بھی کسی زمانہ میں قوّت عقل اور جودت طبع اور مادّۂ ایجاد ضرور موجود ہوگا جس کی بدولت وہ باتیں ایجاد ہوئیں جو اب رسمیں ہیں اس لئے کہ اُن کے بزرگ ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ اور حسن معاشرت کے فنوں سے واقف پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ سب باتیں اُنہوں نے اپنی محنت اور علم اور عقل اور جودت طبع سے ایجاد کی تھیں اور انہی وجوہات سے دنیا کی نہایت بڑی اور قوی اور مشہور قوموں سے ہوگئے تھے مگر اب اُن کا حال دیکھو کہ کیا ہے اسی رسومات کی پابندی سے اُن کا مآل یہ ہوا ہے کہ اَب وہ ایسی قوموں کے محکوم ہیں اور ایسے لوگوں کی آنکھوں میں ذلیل ہیں جن کے آبا و اجداد اُس وقت جنگلوں میں آوارہ پڑے پھرتے تھے۔ جس وقت اُن قوموں کے آبا و اجداد عالی شان محلوں میں رہتے تھے اور بڑے بڑے عبادت خانے اور عمارات شاہی اور شہنشاہی محل بنواتے تھے اس کا سبب یہی تھا کہ اُس زمانہ میں اُن قوموں میں رسم کی پابندی قطعی نہ تھی اور جو کسی قدر تھی تو اُس

ساتھ ہی آزادی اور ترقی کا جوش اُن میں قائم تھا۔
تواریخ سے ثابت ہے کہ ایک قوم کسی قدر عرصہ تک ترقی کی حالت پر رہتی ہے اور اُس کے بعد ترقی مسدود ہو جاتی ہے مگر یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ ترقی کب مسدود ہوتی ہے۔ یہ اسی وقت مسدود ہوتی ہے جبکہ اُس قوم میں سے وہ قوت اُٹھ جاتی ہے جس کے سبب سے نئی نئی باتیں پیدا ہوتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک مسلمانوں کا اِس زمانہ میں یہی حال ہے بلکہ میں نے غلطی کی کیونکہ ترقی مسدود ہونے کا زمانہ بھی گذر گیا اور تنزّل اور ذلّت و خواری کا زمانہ بھی انتہا درجہ کو پہنچ گیا ہے۔
ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ بات کہے کہ یورپ کی قوموں میں بھی جو اِس زمانہ میں ہر قسم کی ترقی کی حالت میں شمار ہوتی ہیں بہت سی رسمیں ہیں اور اُن رسموں کی نہایت درجہ پر پابندی ہے تو وہ قومیں کیوں ترقی پر ہیں۔
یہ اعتراض صحیح ہے اور درحقیقت یورپ میں رسموں کی پابندی کا نہایت نقصان ہے اور اگر اُس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی جیسے کہ اب تک ہوتی رہی ہے تو اُن کو بھی بدنصیبی کا دِن پیش آویگا مگر یورپ میں اور مشرقی ملکوں کی پابندیٔ رسومات میں ایک بڑا فرق ہے۔ یورپ میں رسومات کی پابندی ایک عجیب اور نئی بات ہونے کو تو مانع ہے مگر رسومات کی تبدیلی کا کوئی مانع نہیں۔
اگر کوئی شخص عمدہ رسم نکالے اور سب لوگ پسند کریں فی الفور پرانی رسم

چھوڑ دی جاویگی اور نئی رسم اختیار کر لی جاویگی اور اِس سبب سے
اُن لوگوں کے قوائے عقلی اور حالت تمیز اور قوت ایجاد ضایع نہیں ہوتی
تم دیکھو کہ یہ پوشاک جو اَب انگریزوں کی ہے اُن کے باپ دادا کی
نہیں ہے بالکل اپنی پوشاک بدل دی ہے۔ ہر درجہ کے لوگوں کا جو مختلف
لباس تھا اُس رسم کو چھوڑ دیا گیا ہے اور ضرور سمجھا گیا ہے کہ ہر شخص ایک سا
مثل اوروں کی لباس پہنے۔ اِس وقت کوئی رسم یورپ میں ایسے درجہ
پر نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی رسم اُس کے بر خلاف مگر اُس سے
عمدہ ایجاد کرے اور لوگ اُس پر اتفاق کریں اُسی وقت تبدیل نہ ہو سکے
اور ایسی تبدیلی کے ساتھ ان کی ترقی بھی ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نئی نئی
کلیں ہمیشہ ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور تاوقتیکہ اُن کی جگہ بہتر کلیں ایجاد
نہ ہو جاویں وہ بدستور رہتی ہیں۔ ملکی معاملات اور تعلیم میں بلکہ اخلاق
میں بلکہ مذہب میں ہمیشہ ترقی کے خواہاں ہیں۔ پس یہ تصور کرنا کہ
یورپ بھی مثل ہمارے مگر دوسری قسم کی رسموں میں مبتلا ہے محض
نادانی اور ناواقفیت کا سبب ہے۔

البتہ یورپ میں اور بالتخصیص انگریزوں میں جو بات نہایت عمدہ
اور قابل تعریف اور لائق خواہش کے ہے اور درحقیقت بغیر اس کے
کوئی قوم مہذب اور تربیت یافتہ نہیں ہو سکتی وہی بات اُس کی تنزل
کا باعث ہو گی بشرطیکہ اُس کی اصلاح نہ ہوتی رہیگی۔ اور وہ یہ ہے
کہ تمام انگریز جو حُبِ وطن میں نامی ہیں اِس بات پر نہایت کوشش

اور جانفشانی کر رہے ہیں کہ کُل قوم کے لوگ یکساں ہو جاویں اور سب اپنے خیالات اور طریقے یکساں مسائل اور قواعد کے تحتِ حکومت کر دیں اور ان کوششوں کا نتیجہ انگلستان میں روز بروز ظاہر ہوتا جاتا ہے جو حالات کہ اب خاص خاص لوگوں اور فرقوں کے پائے جاتے ہیں اور جن کے سبب ان کی خاص خاص عادتیں قائم ہوئی ہیں وہ اب روز بروز ایک دوسرے کے مشابہ ہوتی جاتی ہیں۔ انگلستان میں اس زمانہ سے پہلے مختلف درجوں کے لوگ اور مختلف ہمسایوں کے لوگ اور مختلف پیشہ والے گویا جُدی جُدی دنیا میں رہتے تھے یعنی سب کا طریقہ اور عادت جُدا جُدا تھی۔ اب وہ سب طریقے اور عادتیں ہر ایک کی ایسی مشابہ ہو گئی ہیں کہ گویا سب کے سب ایک محلہ کے رہنے والے ہیں۔ انگلستان میں بہ نسبت سابق کے اب بہت زیادہ رواج ہو گیا ہے کہ لوگ ایک ہی قسم کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اور ایک ہی سی باتیں سُنتے ہیں اور ایک ہی سی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی سے مقاموں میں جاتے ہیں اور یکساں باتوں کی خواہش رکھتے ہیں اور یکساں ہی چیزوں کا خوف کرتے ہیں اور ایک ہی سے حقوق اور آزادی سب کو حاصل ہے اور اُن حقوق اور آزادیوں کے قائم رکھنے کے ذریعے بھی یکساں ہیں اور یہ مشابہت اور مساوات روز بروز ترقی پاتی جاتی ہے۔ اور تعلیم و تربیت کی مشابہت اور مساوات سے اس کو اور زیادہ وسعت ہوتی ہے۔ تعلیم کے اثر سے

تمام لوگ عام خیالات کے اور غلبہ اور رائے کے پابند ہوتے جاتے ہیں۔ اور جو عام ذخیرہ حقایق اور مسائل اور رایوں کا موجود ہے اُس پر سب کو رسائی ہوتی ہے۔ آمد و رفت کے ذریعوں کی ترقی سے مختلف مقاموں کے لوگ مجتمع اور شامل ہوتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں اور اس سبب سے بھی مشابہت مذکور ترقی پاتی ہے۔ کارخانوں اور تجارت کی ترقی سے آسائش اور آرام کے وسیلے اور فائدے زیادہ شائع ہوتے ہیں اور ہر قسم کی عالی ہمتی بلکہ بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے کام ایسی حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ ہر شخص اُن کے کرنے کو موجود و مستعد ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا گروہ پر منحصر نہیں رہا ہے۔ بلکہ اولوالعزمی تمام لوگوں کی خاصیت ہوتی جاتی ہے اور ان سب پر آزادی اور عام رائے کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اور یہ تمام امور ایسے ہیں جیسے انگلستان کے تمام لوگوں کی رائیں اور عادتیں اور طریق زندگی اور قواعد معاشرت اور امورات رنج و راحت یکساں ہوتے جاتے ہیں اور بلاشبہ ملک اور قوم کے مہذب ہونے کا اور ترقی پر پہنچنے کا یہی نتیجہ ہے اور ایسا عمدہ نتیجہ ہے کہ اُس سے عمدہ نہیں ہو سکتا۔

مگر باوصف اس کے ہم اس نتیجہ کو بشرطیکہ اس کی اصلاح نہ ہوتی رہے باعث تنزل قرار دیتے ہیں تو ضرور ہم کو کہنا پڑیگا کہ کیوں یہ عمدہ نتیجہ باعث تنزل ہوگا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جب سب لوگ ایک سی طبیعت اور عادت اور خیال کے ہو جاتے ہیں تو اُن کی

طبیعتوں میں سے وہ قوتیں جو نئی باتوں کے ایجاد کرنے اور عمدہ عمدہ خیالات کے پیدا کرنے اور قواعد حسن معاشرت کو ترقی دینے کی ہیں زائل اور کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ ترقی ٹھہر جاتی ہے اور پھر ایسا زمانہ ہوتا ہے کہ تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

اس معاملہ میں ہم کو ملک چین کے حالات پر غور کرنے سے عبرت ہوتی ہے۔ چینی بہت لائق آدمی ہیں بلکہ اگر بعض باتوں پر لحاظ کیا کیا جاوے تو عقلمند بھی ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ اُن کی خوش قسمتی سے ابتدا ہی میں ان کی قوم میں بہت اچھی اچھی رسمیں قائم ہو گئیں۔ اور یہ کام اُن لوگوں کا تھا جو اس قوم میں نہایت دانا اور بڑے حکیم تھے۔

چین کے لوگ اس باب میں مشہور معروف ہیں کہ جو عمدہ سے عمدہ دانش اور عقل کی باتیں اُن کو حاصل ہیں اُن کو ہر شخص کی طبیعت پر بخوبی منقش کرنے کے واسطے اور اس بات کے لئے کہ جن شخصوں کو وہ دانشمندی کی باتیں حاصل ہیں اُن کو بڑے بڑے عہدے ملیں نہایت عمدہ طریقے اُن میں رائج ہیں۔ اور وہ طریقے حقیقت میں بہت ہی عمدہ ہیں بے شک جن لوگوں نے اپنا ایسا دستور قائم رکھا انھوں نے انسان کی ترقی کے اسرار کو پا لیا اور اس سے لئے چاہیئے تھا کہ وہ قوم تمام دُنیا میں ہمیشہ افضل رہتی

مگر برخلاف اس کے اُن کی حالت سکون پذیر ہو گئی ہے اور ہزاروں برس سے ساکن ہے اور اگر اُن کی کبھی کچھ اور ترقی ہوگی تو بے شک غیر ملکوں کے لوگوں کی بدولت ہوگی۔ اس خرابی کا سبب یہی ہوا کہ اُس تمام قوم کی حالت یکساں اور مشابہ ہو گئی اور سب کے خیالات اور طریق معاشرت ایک سے ہو گئے اور سب کے سب یکساں قواعد اور مسائل کی پابندی میں پڑ گئے اور اس سبب سے وہ قوتیں جن سے انسان کو روز بروز ترقی ہوتی ہے اُن میں سے معدوم ہو گئیں۔

پس جبکہ ہم مسلمان ہندوستان کے رہنے والے جن کی رسومات بھی عمدہ اصول و قواعد پر مبنی نہیں ہیں بلکہ کوئی رسم اتفاقیہ اور کوئی رسم بلا خیال اور قوموں کے اختلاط سے آگئی ہے جس میں ہزاروں نقص اور بُرائیاں ہیں پھر ہم اُن رسموں کے پابند ہوں اور نہ اُن کی بھلائی بُرائی پر غور کریں اور نہ خود کچھ اصلاح اور درستی کی فکر میں ہوں بلکہ اندھا دھندی سے اُنہی کی پیروی کیے چلے جاویں۔ تو سمجھنا چاہئے کہ ہمارا حال کیا ہو گیا ہے اور آیندہ کیا ہونے والا ہے۔

ہماری نوبت چینیوں کے حال سے بھی رسومات کی پابندی کے سبب بدتر ہو گئی ہے اور اب ہم میں خود اتنی طاقت نہیں رہی کہ ہم اپنی ترقی کر سکیں۔ اس لئے بجز اس کے کہ دوسری قوم ہماری ترقی اور ہمارے قوائے عقلی کی تحریک کا باعث ہو اور کچھ چارہ نہیں۔

بعد اس کے کہ ہمارے قوائے عقلیہ تحریک میں آجاویں اور پھر قوت ایجاد ہم میں شگفتہ ہو۔ تب ہم پھر اس قابل ہونگے کہ خود اپنی ترقی کے لئے کچھ کر سکیں۔

مگر جبکہ ہم دوسری قوموں سے از راہ تعصب نفرت رکھیں اور کوئی نیا طریقہ زندگی کا گو وہ کیسا ہی بے عیب ہو اختیار کرنا صرف بسبب اپنے تعصب یا رسم و رواج کی پابندی کے معیوب سمجھیں تو پھر ہم کو اپنی بھلائی اور اپنی ترقی کی کیا توقع ہے۔

مگر چونکہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور ایک مذہب رکھتے ہیں جس کو ہم دل سے سچ جانتے ہیں اس لئے ہم کو مذہبی پابندی ضرور ہے اور وہ اسی قدر ہے کہ جو بات معاشرت اور تمدن اور زندگی بسر کرنے اور دنیاوی ترقی کی اختیار کرتے ہیں اُس کی نسبت اتنا دیکھ لیں کہ وہ مباحات شرعیہ میں سے ہے یا محرمات شرعیہ میں سے در صورت ثانی بلاشبہ ہم کو احتراز کرنا چاہئے اور در صورت اول بلا لحاظ پابندی رسوم کے اور بلا لحاظ اس بات کے کہ لوگ ہم کو بُرا کہتے ہیں یا بھلا اُس کو اختیار کرنا ضرور بلکہ واسطے ترقی قومی کے فرض ہے۔

(سر سید)

آزادیٔ رائے

ہم اپنے اس آرٹیکل کو ایک بڑے لایق اور قابل زمانۂ حال کے

فیلسوف کی تحریر سے اخذ کرتے ہیں۔ رائے کی آزادی ایک ایسی چیز
ہے کہ ہر ایک انسان اُس پر پورا پورا حق رکھتا ہے فرض کرو کہ تمام
آدمی بجز ایک شخص کے کسی بات پر متفق الرائے ہیں مگر صرف وہی ایک
شخص اُن کے برخلاف رائے رکھتا ہے تو اُن تمام آدمیوں کو اُس
ایک شخص کی رائے کو غلط ٹھہرانے کے لئے اُس سے زیادہ کچھ استحقاق
نہیں ہے جتنا کہ اُس ایک شخص کو اُن تمام آدمیوں کی رائے کے غلط
ثابت کرنے کا (اگر وہ ثابت کر سکے) استحقاق حاصل ہے۔ کوئی وجہ
اِس بات کی نہیں ہے کہ پانچ آدمیوں کو بمقابلہ پانچ آدمیوں کی
رایوں کے غلط ٹھہرانے کا استحقاق ہو اور ایک آدمی کو بمقابل نو
آدمیوں کے یہ استحقاق نہ ہو۔ رائے کی غلطی آدمیوں کی تعداد کی
کمی بیشی پر منحصر نہیں ہے بلکہ قوت استدلال پر منحصر ہے جیسے کہ یہ بات
ممکن ہے کہ نو آدمیوں کی رائے بمقابلہ ایک شخص کے صحیح ہو ویسے
ہی یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے بمقابل نو کے صحیح ہو۔

رایوں کا بند رہنا خواہ بسبب کسی مذہبی خوف کے اور خواہ
بسبب اندیشہ برادری و قوم کے اور خواہ بدنامی کے ڈر سے اور
یا گورنمنٹ کے ظلم سے نہایت ہی بری چیز ہے۔ اگر رائے اس قسم
کی کوئی چیز ہوتی جس کی قدر و قیمت صرف اُس رائے والے کی ذات
ہی سے متعلق اور اُسی میں محصور ہوتی تو رایوں کے بند رہنے سے
ایک خاص شخص کا یا معدودے چند کا نقصان متصور ہوتا مگر رایوں

کے بند رہنے سے تمام انسانوں کی حق تلفی ہوتی ہے اور کل انسانوں
کو نقصان پہنچتا ہے اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو بلکہ اُن کو بھی جو
آیندہ پیدا ہونگے۔

اگرچہ رسم و رواج بھی اُس کے برخلاف رایوں کے اظہار کیلئے
ایک بہت قوی مزاحم کار گنا جاتا ہے لیکن مذہبی خیالات مخالف مذہب
رائے کے اظہار اور مشتہر ہونے کے لئے نہایت اقوے مزاحم کار ہوتے
ہیں۔ اِس قسم کے لوگ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ اُس مخالف
رائے کا ظاہر ہونا اُن کو ناپسند ہوا ہے بلکہ اُسی کے ساتھ جوش
مذہبی اُمنڈ آتا ہے اور عقل کو سلیم نہیں رکھتا۔ اور اُس حالت میں
اُن سے ایسے افعال و اقوال سرزد ہوتے ہیں جو اُنہیں کے مذہب کو
جس کے وہ طرفدار ہیں مضرت پہنچاتے ہیں۔ وہ خود اِس بات کے
باعث ہوتے ہیں کہ مخالفوں کے اعتراض لا معلوم رہیں۔ وہ خود
اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ بسبب پوشیدہ رہنے اُن اعتراضوں
کے اُنہیں کے مذہب کے لوگ اُن کے حل پر متوجہ نہ ہوں اور
مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیق کئے اور بلا رفع کئے باقی رہ جاویں
وہ خود اِس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ اُن کی آیندہ نسلیں
بسبب نا تحقیق باقی رہ جانے ان اعتراضوں کے جس وقت اُن
اعتراضوں سے واقف ہوں اُسی وقت مذہب سے منحرف ہو جاویں
وہ خود اس بات کے باعث ہوتے ہیں کہ وہ اپنی نادانی سے تمام

دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ اُس مذہب کو جس کے وہ پیرو ہیں مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت ہی اندیشہ ہے اگر اُنہی کے مذہب کا کوئی شخص بغرض حصول اغراض مذکورہ اُن کا پھیلانا چاہے تو خود اُس کو معترض کی جگہ تصور کرتے ہیں اور اپنی نادانی سے دوست کو دشمن قرار دیتے ہیں۔

کیا عمدہ رائے اُس فیلسوف کی ہے کہ "کسی رائے کے حامیوں کا اُس رائے کے برخلاف رائے کے مشتہر ہونے میں مزاحمت کرنے سے خود اُن حامیوں کا بہ نسبت اُن کے مخالفوں کے زیادہ تر نقصان ہے اِس لئے کہ اگر وہ رائے صحیح و درست ہو تو اُس کی مزاحمت سے غلطی کے بدلے صحیح بات حاصل کرنے کا موقع اُن کے ہاتھ سے جاتا ہے اور اگر وہ غلط ہے تو اِس بات کا موقع باقی نہیں رہتا کہ غلطی اور صحت کے مقابلہ سے جو صحت کو زیادہ استحکام اور اُس کی سچائی زیادہ تر دلوں پر موثر ہوتی ہے اور اُس کی روشنی دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اِس نتیجہ کو حاصل کریں جو فی الحقیقت نہایت عمدہ فائدہ ہے"

کچھ شبہ نہیں ہے کہ عموماً مخالف اور موافق رایوں کا پھیلنا اور منتشر ہونا خواہ وہ دینی معاملہ سے علاقہ رکھتی ہوں یا دنیوی معاملہ سے نہایت ہی عمدہ اور مفید ہے۔ دونوں قسم کی رایوں پر جُدا جُدا غور کرنے کا موقع ملتا ہے کہ اُن میں سے کونسی بہتر ہے یا اُن دونوں کی تائید ایسے دلائل سے ہوتی ہے جو جُداگانہ ہر ایک کے مناسب حال

ہم کو اِس بات کا کبھی یقین کامل نہیں ہو سکتا کہ جس رائے کی مزاحمت میں پابند رہتے ہیں یا ہم کوشش کرتے ہیں وہ غلط ہی ہے اور اگر یقین بھی ہو کہ وہ غلط ہے تو بھی اُس کی مزاحمت اور اُس کا انسداد بُرائی سے خالی نہیں۔

فرض کرو کہ جس رائے کا بند کرنا ہم چاہتے ہیں حقیقت میں وہ رائے صحیح و درست ہے اور جو لوگ اُس کا انسداد چاہتے ہیں وہ اُس کی درستی اور صحت سے منکر ہیں مگر غور کرنا چاہئے کہ وہ لوگ یعنی اُس رائے کے بند کرنے والے ایسے نہیں ہیں جن سے غلطی اور خطا ہونی ممکن نہ ہو تو اُن کو اس بات کا حق نہیں ہے کہ وہ اُس خاص معاملہ کو تمام انسانوں کے لئے خود فیصل کریں اور اَور شخصوں کو اپنی رائے کام میں لانے سے محروم کردیں۔ کسی مخالف رائے کی سماعت سے اس وجہ سے اِنکار کرنا کہ ہم کو اُس کے غلط ہونے کا یقین ہے گویا یہ کہنا ہے کہ ہمارا الیقین یقینِ کامل کا رتبہ رکھتا ہے اور اُس بحث و گفتگو کی مخالفت کرنا انبیاء سے بھی بڑھ کر اپنا رتبہ ٹھہرانا ہے اور اپنے تئیں ایسا سمجھنا ہے کہ ہم سے سہو و خطا کا ہونا ناممکن ہے

انسانوں کی سمجھ پر بڑا افسوس ہے کہ جس قدر کہ وہ اپنے خیال و قیاس میں اپنے سے اِس مشہور مقولہ کی سند پر کہ "الانسان مرکبٌ من الخطاء والنسیان" سہو و خطا کا ہونا ممکن سمجھتے ہیں اُس قدر اپنی رایوں اور اپنی باتوں کے عملدر آمد میں نہیں سمجھتے

اُس کی عملی باتوں سے اُس کی قدر و منزلت نہایت ہی خفیف معلوم ہوتی ہے۔ گو خیال و قیاس میں اُس کی کیسی ہی بڑی قدر و منزلت سمجھتے ہوں۔ اگرچہ سب اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم سے سہو و خطا ہونی ممکن ہے مگر بہت ہی کم آدمی ایسے ہونگے جو اُس کا خیال رکھنا اور ازروئے عمل کے بھی اُس کی احتیاط کرنا ضرور سمجھتے ہوں اور عملی طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہوں کہ جس رائے کی صحت کا اُن کو خوب یقین ہے شاید وہ اُسی سہو خطا کی مثال ہو جس کا ہونا وہ اپنے سے ممکن سمجھتے ہیں۔

جو لوگ کہ دولت یا منصب اور حکومت یا علم کے سبب غیر محدود تعظیم و ادب کے عادی ہوتے ہیں وہ تمام معاملات میں اپنی رایوں کے صحیح ہونے پر یقین کامل رکھتے ہیں اور اپنے میں سہو و خطا ہونے کا احتمال بھی نہیں کرتے اور جو لوگ اُن سے کسی قدر زیادہ خوش نصیب ہیں یعنی وہ کبھی کبھی اپنی رایوں پر اعتراض اور حجت اور تکرار ہوتے ہوئے سنتے ہیں اور کچھ کچھ اس بات کے عادی ہوتے ہیں کہ جب غلطی پر ہوں تو متنبہ ہونے پر اُس کو چھوڑ دیں اور درست بات کو مان لیں اگرچہ اُن کو اپنی ہر ایک رائے کی درستی پر یقین کامل تو نہیں ہوتا مگر اُن رایوں کی درستی پر ضرور یقین ہوتا ہے جن کو وہ لوگ جو اُن کے اردگرد رہتے ہیں یا ایسے لوگ جن کی بات کو وہ نہایت ادب و تعظیم کے قابل سمجھتے ہیں اُن رایوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ایک

قاعدہ کلیہ ہے کہ جو شخص جس قدر اپنی ذاتی رائے پہ اعتماد نہیں
رکھتا وہ شخص اُسی قدر دُنیا کی رائے پر عموماً زیادہ تر اعتماد رکھتا ہے
جس کو بعض اصطلاحوں میں جمہور کی رائے یا جمہور کا مذہب کہا جاتا ہے؛
مگر یہ بات سمجھنی چاہئے کہ ایسے لوگوں کے نزدیک دنیا سے یا جمہور سے
کیا مراد ہوتی ہے ہر ایسے شخص کے نزدیک دنیا سے اور جمہور سے وہ
چند اشخاص معدود مراد ہوتے ہیں جن سے وہ اشتقار رکھتا ہے یا
جن سے وہ ملتا جلتا ہے مثلاً اُس کے دوستوں یا ہم رایوں کا فریق
یا اُس کی ذات برادری کے لوگ یا اُس کے درجہ و رتبہ کے لوگ۔
پس اُس کے نزدیک تمام دنیا اور جمہور کے معنی اُسی میں ختم ہو جاتے
ہیں۔ اور اس لئے وہ شخص اس رائے کو دنیا کی یا جمہور کی رائے
سمجھ کر اُس کی درستی پر زیادہ تر یقین کرتا ہے۔ اس ہیئت مجموعی رائے
کا جو اعتماد اور یقین اُس کو زیادہ ہوتا ہے اور ذرا بھی اُس میں لغزش
نہیں آتی۔ اُس کا سبب یہ ہی ہوتا ہے کہ وہ اس بات سے واقف
نہیں ہوتا کہ اُس کے زمانہ سے پہلے اور زمانوں کے اور ملکوں کے۔
اور فرقوں کے اور مذہبوں کے لوگ اُس میں کیا رائے رکھتے تھے
اور اب بھی اور ملکوں اور فرقوں اور مذہبوں کے لوگ کیا رائے
رکھتے ہیں۔ ایسے شخص کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ اس بات کی جوابدہی
کو کہ درحقیقت وہ راہ راست پر چلتا ہے اپنی فرضی دنیا یا جمہور کے
ذمہ ڈالتا ہے پس جو کچھ اُس کی رائے یا اُس کا حال ہو کچھ بھی اعتبار

اور یقین کے لایق نہیں ہے اس لئے کہ جن وجوہات سے وہ شخص بسبب
مسلمان خاندان میں پیدا ہونے کے اس وقت بڑا مقدس مسلمان ہے
اُنہی وجوہات سے اگر وہ عیسائی خاندان یا ملک یا بُت پرست خاندان
یا ملک میں پیدا ہوتا تو وہ بھلا چنگا عیسائی یا بت پرست ہوتا۔ وہ
مطلق اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ جس طرح کسی خاص شخص کا
خطا میں پڑنا ممکن ہے اُسی طرح اُس کی فرضی دنیا اور خیالی جمہور کی تو
کیا حقیقت ہے زمانہ کے زمانہ کا اور اُس سے بھی بہت بڑی دُنیا کا
خطا میں پڑنا ممکن ہے۔ تاریخ سے اور علوم موجودہ سے بخوبی ظاہر ہے
کہ ہر زمانہ میں ایسی ایسی رائیں قایم ہوئیں اور مسلّم قرار پائیں جو
اُس کے بعد کے زمانہ میں صرف غلط ہی نہیں بلکہ سراسر لغو و مہمل
سمجھی گئیں اور یقیناً اس زمانہ میں بھی بہت سی ایسی رائیں مروّج
ہونگی جو کسی آیندہ زمانہ میں اسی طرح مردود اور نامعقول ٹھہریں گی
جیسے کہ بہت سی وہ رائیں جو اگلے زمانہ میں عام طور پر مروّج تھیں
اور اب مردود ہو گئی ہیں۔

اِس تقریر پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جو لوگ مخالف رائے کو
غلط اور مضر سمجھ کر اُس کی مزاحمت کرتے ہیں اُس سے اُن کا مطلب
اس بات کا دعویٰ کرنا کہ وہ غلطی سے آزاد و بری ہیں نہیں ہوتا بلکہ
اُس سے اُس فرض کا ادا کرنا مقصود ہوتا ہے جو اُن پر باوصف قابل
سہو و خطا ہونے کے اپنے ایمان اور اپنے یقین کے مطابق عمل کرنے کا ہے

اگر لوگ اس وجہ سے اپنی رایوں کے موافق کاربند نہ ہوں کہ شاید وہ غلط ہوں تو کوئی شخص اپنا کوئی کام بھی نہیں کرسکتا۔ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ حتی المقدور اپنی نہایت درست رائیں قائم کریں اور بغور اُن کو قرار دیں اور جب اُن کی درستی کا بخوبی یقین ہوجاوے تو اُس کے مخالف رایوں کے بند کرنے اور مزاحمت کرنے میں کوشش کریں۔ آدمیوں کو اپنی استعداد و قابلیت کو نہایت عمدہ طور سے برتنا چاہئے یقین کامل کسی امر میں نہیں ہوسکتا مگر ایسا یقین ہوسکتا ہے جو انسان کے مطالب کے لئے کافی ہو۔ انسان اپنی کارروائی کے لئے اپنی رائے کو درست و صحیح سمجھ سکتے ہیں اور اُن کو ایسا ہی سمجھنا چاہئے اور وہ اس سے زیادہ اور کوئی بات اس صورت میں اختیار نہیں کرتے جبکہ وہ خراب آدمیوں کو ممانعت کرتے ہیں کہ ایسی رایوں کے شایع کرنے سے جو اُن کے نزدیک فاسد اور مضر ہیں لوگوں کو خراب یا بد اخلاق یا بدمذہب نہ کریں۔

مگر مخالف رائے کے بند کرنے میں صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ اُنہوں نے اپنے تئیں قابل سہو خطا سمجھ کر اپنے ایمان اور اپنے یقین کے موافق عمل کیا ہے بلکہ اُس سے بہت زیادہ کیا جاتا ہے اِس بات میں کہ ایک رائے کو اِس وجہ سے صحیح سمجھا جاوے کہ اُس پر اعتراض و حجت کرنے کا ہر طرح پر لوگوں کو موقع دیا گیا اور اُس کی تردید نہ ہوسکی اور اِس بات میں کہ ایک رائے کو

اس وجہ سے مان لیا گیا کہ اُس کی تردید کی کسی کو اجازت نہیں ہوئی زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ پس مخالف رایوں کی مزاحمت کرنے والے اپنی رائے کو اس وجہ سے صحیح نہیں سمجھتے کہ اُس کی تردید نہیں ہوسکی بلکہ اس لئے صحیح ٹھہراتے ہیں کہ اُس کی تردید کی اجازت نہیں ہوئی۔ حالانکہ جس شرط سے ہم بطور جائز اپنی رائے کو عملدر آمد ہونے کے لئے درست قرار دے سکتے ہیں وہ صرف یہی ہے کہ لوگوں کو اس بات کی کامل آزادی ہو کہ وہ اُس رائے کے برخلاف کہیں اور اُس کو غلط ثابت کریں اِس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ انسان جس کے قوائے عقلی اور قوائے کامل نہیں ہیں۔ اپنے آپ کو راہ راست پر ہونے کا یقین کرسکے اہل مذاہب جو صرف اپنے معتقد فیہ کی پیروی ہی کو راہ راست سمجھتے ہیں جب تک کہ وہ کبھی اس بات پر مباحثہ اور اظہار رائے کی اجازت نہ دیں کہ جس طرح پر اُن کا عملدر آمد اور چال چلن یا اعتقاد اور خیال ہے وہ صحیح طور سے اُن کے معتقد فیہ کی پیروی ہے یا نہیں اُس وقت تک وہ کبھی اپنے آپ کو راہ راست پر ہونے کا یقین نہیں کرسکتے۔

انسان کی پچھلی حالتوں کو موجودہ حالتوں سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں انسانوں کا یہی حال ہے کہ سو میں سے ایک ہی شخص اس قابل ہوتا ہے کہ کسی دقیق معاملہ پر رائے دے اور ننانوے ۹۹ شخص اس میں رائے دینے کی لیاقت نہیں رکھتے۔ مگر اس

ایک آدمی کی رائے کی عمدگی بھی صرف اضافی ہوتی ہے اس لئے کہ
اگلے زمانہ کے لوگوں میں اکثر آدمی جو سمجھ بوجھ اور لیاقت میں مشہور
تھے ایسی رائیں رکھتے تھے کہ جن کی غلطی اب بخوبی روشن ہوگئی ہے
بہت سی ایسی باتیں اُن کو پسندیدہ اور اُن کے عملدرآمد تھیں جن کو
اب کوئی بھی ٹھیک اور درست نہیں سمجھتا اور اس سے ثابت ہوتا ہے
کہ انسانوں میں ہمیشہ معقول رایوں اور پسندیدہ رایوں کو غلبہ رہتا
ہے مگر اس کا سبب بجز انسان کی عقل و فہم کی ایک عمدہ صفت
کے جو نہایت ہی پسندیدہ ہے اور کوئی نہیں۔ اور وہ صفت یہ ہے
کہ انسان کی غلطیاں اصلاح کی صلاحیت رکھتی ہیں یعنی انسان
اپنی غلطیوں کو مباحثہ اور تجربہ کے ذریعہ سے درست کرنے کی لیاقت
رکھتا ہے پس انسان کی رائے کی تمامہ قوت اور قدر و منزلت کا
حصر اس ایک بات پر ہے کہ جب وہ غلط ہو تو صحیح کی جا سکتی ہے مگر
اُس پر اعتماد اُسی وقت کیا جا سکتا ہے جبکہ اُس کے صحیح کرنے کے ذریعے
ہمیشہ برتاؤ میں رکھے جاویں۔ خیال کرنا چاہئے کہ جس آدمی کی رائے
حقیقت میں اعتماد کے قابل ہے اُس کی وہ رائے اس قدر و منزلت
کو کس وجہ سے پہنچی ہے۔ اسی وجہ سے پہنچی ہے کہ اُس نے ہمیشہ اپنی
طبیعت پر اس بات کو گوارا رکھا ہے کہ اُس کی رائے پر نکتہ چینیاں
کی جاویں اور اُس نے اپنا طریقہ یہ ٹھہرایا ہے کہ اپنے مخالف کی رائے
کو ٹھنڈے دل سے سُنا اور اُس میں جو کچھ درست اور واجب تھا اُس سے

خود مستفید ہونا اور جو کچھ اُس میں غلط اور ناواجب تھا اُس کو سمجھ لینا اور
موقع پر اُس غلطی سے اوروں کو بھی آگاہ کر دینا ایسا شخص گویا اس بات کو
عملی طور پر تسلیم کرتا ہے کہ جس طریقہ سے انسان کسی معاملہ کے کل مدارج کو
جان سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اُس کی بابت ہر قسم کی رائے کے
لوگوں کی گفتگو کو سُنے اور جن جن طریقوں سے ہر سمجھ اور طریقہ اور طبیعت
کے آدمی اُس معاملہ پر نظر کریں اُن سب طریقوں کو سوچے اور سمجھے
کسی دانا آدمی نے اپنی دانائی بجز اِس طریقہ کے اور کسی طرح پر حاصل
نہیں کی۔ انسان کی عقل و فہم کا خاصہ یہی ہے کہ وہ اِس طور کے
سوا اور کسی طور سے مہذّب اور معقول ہو ہی نہیں سکتی اور صرف اِس
بات کی مستقل عادت کے سوا کہ اپنی رائے کو اوروں کی رایوں سے
مقابلہ کرکے اُس کی اصلاح و تکمیل کیا کرے اور کوئی بات اُس پر
اعتماد کرنے کی وجہ متصوّر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اِس صورت میں
اُس شخص نے لوگوں کی اُن تمام باتوں کو جو اُس کے برخلاف کہہ سکتے
تھے بخوبی سُنا اور تمام معترضوں کے سامنے اپنی رائے کو ڈالا اور عوض
اس کے کہ مشکلاتوں اور اعتراضوں کو چھپا دے خود اُس نے جستجو کی
اِدھر ہر طرف سے جو کچھ روشنی پہنچی اُس کو بند نہیں کیا تو ایسا شخص البتہ
اِس بات کے خیال کرنے کا استحقاق رکھتا ہے کہ میری رائے ایسے
شخص یا اشخاص سے جنہوں نے اپنی رائے کو اس طرح پر پختہ نہیں کیا
بہتر و فایق ہے۔

جس شخص کو اپنی راے پر کسی قدر بھروسا کرنے کی خواہش ہو یا یہ خواہش رکھتا ہو کہ عام لوگ بھی اُس کو تسلیم کریں اس کا طریقہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے کو عام مباحثہ اور ہر قسم کے لوگوں کو اعتراضوں کے لئے حاضر کرے اگر نیوٹن صاحب کی حکمت اور ہیئت اور مسئلہ ثقل پر اعتراض اور حجت کرنے کی اجازت نہ ہوتی تو دنیا اُس کی صحت اور صداقت پر ایسا پختہ یقین نہ کر سکتی جیسا کہ اب کرتی ہے کیا کچھ مخالفت ہے جو لوگوں نے اُس دانا حکیم کے ساتھ نہیں کی اور کونسی مذہبی لعن وطعن ہے جو اُس سچے اور سچی رائے رکھنے والے حکیم کو نہیں دیگئی مگر غور کرنا چاہیے کہ اُس کا نتیجہ کیا ہوا۔ یہ ہوا کہ آج تمام دنیا کیا دانا اور کیا نادان۔ کیا حکیم اور کیا متعصب اہل مذہب سب اُسی کو تسلیم کرتے ہیں اور اُسی کو سچ جانتے ہیں اور مذہبی عقائد سے بھی زیادہ اُس کی سچائی دلوں میں بیٹھی ہے بغیر آزادی رائے کے کسی چیز کی سچائی دریافت ہونی ممکن ہے دریافت نہیں ہو سکتی جن اعتقادوں کو ہم نہایت جائز و درست سمجھتے ہیں اُن کے جواز و درستی کی اور کوئی سند اور بنیاد بجز اس کے نہیں ہو سکتی کہ تمام دنیا کو اختیار دیا جاوے کہ وہ اُن کو بے بنیاد ثابت کریں۔ اگر وہ لوگ ایسا قصد نہ کریں یا کریں اور کامیاب نہ ہوں تو بھی ہم اُن پر یقین کامل رکھنے کے مجاز نہیں ہیں۔ البتہ ایسی اجازت دینے سے ہم نے ایک ایسا نہایت عمدہ ثبوت اُن کی صحت کا حاصل کیا ہے جو انسانوں کی

عقل کی حالت موجودہ سے ممکن تھا کیونکہ ایسی حالت میں ہم نے کسی
ایسی بات سے غفلت نہیں کی جس سے صحیح صحیح بات ہم تک نہ پہنچ سکتی
ہو۔ اور اگر امر مذکورہ پر مباحثہ کی اجازت جاری رہے تو ہم اُمید کرسکتے
ہیں کہ اگر کوئی بات اُس سے بہتر اور سچ اور صحیح ہے تو وہ اُس وقت
ہم کو حاصل ہو جاویگی جبکہ انسانوں کی عقل و فہم اُس کے دریافت
کرنے کے قابل ہوگی۔ اور اس اثنا میں ہم اِس بات کا یقین کرسکتے
ہیں کہ ہم راستی اور صداقت کے اِس قدر قریب پہنچ گئے ہیں جس قدر
کہ ہمارے زمانہ میں ممکن تھا۔ غرضکہ ایک خطاوار وجود جس کو انسان
کہتے ہیں اگر کسی امر کی نسبت کسی قدر یقین حاصل کرسکتا ہے تو اُس کا
یہی طریقہ ہے جو بیان ہوا اور مسلمانی مذہب کا جو ایک مشہور مسئلہ ہے
کہ الحق یعلو ولا یعلیٰ یہ اُس کی ایک اور نئے تفسیر ہے

مگر ایک بہت بڑا دھوکہ ہے جو انسانوں کو اور بعضی دفعہ نیک
گورنمنٹوں کو بھی آزادی رائے کے بند کرنے پر مائل کرتا ہے اور وہ
مسئلہ شہودہندی کا ہے جس کو غلط اور جھوٹا نام مصلحت عام کا دیا گیا
واللہ درمن قال۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ اور وہ مسئلہ یہ ہے
کہ کسی رائے یا مسئلہ یا عقیدہ کی سچائی اور صحت پر بحث کرنے سے اس لئے
ممانعت کی جاتی ہے کہ گو وہ فی نفسہ کیسا ہی ہو مگر اُس سے عام لوگوں کا
پابند رہنا نہایت مفید اور باعث صلاح و فلاح تمام لوگوں کا ہے اور
فی زماننا ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں یہ رائے بکثرت

رایج ہے بلکہ اس گناہ کے کام کو ایک نیک کام تصور کیا جاتا ہے اس رائے کا نتیجہ یہ ہے کہ مباحثہ اور رایوں کی آزادی کا بند کرنا اُس مسئلہ یا عقیدہ کی صحت اور سچائی پر منحصر نہیں ہے بلکہ زیادہ تر مفید عام ہونے پر منحصر ہے مگر افسوس ہے کہ ایسی رائے رکھنے والے یہ نہیں سمجھتے کہ وہی دعوئے سابق یعنی اپنے آپ کو ناقابل سہو وخطا سمجھنے کا جس سے انہوں نے توبہ کی تھی پھر پھرا کر پھر قائم ہو جاتا ہے صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ پہلے وہ دعوے ایک بات پر تھا اب وہی دعوے دوسری بات پر ہے - یعنی پہلے اُس اصل مسئلہ یا عقیدہ کے سچ ہونے پر تھا اور اب اُس کے مفید عام ہونے پر ہے حالانکہ یہ بات بھی کہ وہ مسئلہ یا عقیدہ مفید عام ہے اسی قدر بحث ومباحثہ کا محتاج ہے جس قدر کہ وہ اصل مسئلہ یا عقیدہ محتاج ہے۔

ایسی رائے رکھنے والے اِس غلطی پر ایک اور دوسری غلطی یہ کرتے ہیں جبکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے صرف اُس کی اصلیت اور سچائی پر بحث کی مخالفت کی ہے اُس کے مفید عام ہونے کی بحث پر مخالفت نہیں کی اور یہ نہیں سمجھتے کہ رائے کی صداقت خود اُس کے مفید عام ہونے کا ایک جزو ہے۔ ممکن نہیں کہ ہم کسی رائے کے مفید عام ہونے پر بغیر اُس کی صحت اور سچائی ثابت کئے بحث کر سکیں۔ اگر ہم یہ بات جاننی چاہتے ہیں کہ آیا فلاں بات لوگوں کے حق میں مفید ہے یا نہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ اِس بات پر توجہ نہ کریں کہ آیا وہ بات سچ اور

صحیح و درست بھی ہے یا نہیں۔ ادنےٰ اور اعلیٰ سب اس بات کو قبول کرینگے کہ کوئی رائے یا مسئلہ یا اعتقاد جو صداقت اور راستی کے برخلاف ہے دراصل کسی کے لئے مفید نہیں ہو سکتا۔

یہ تمام مباحثہ جو ہم نے کیا ایسی صورت سے متعلق تھا کہ رائے مروّجہ اور تسلیم شدہ کو ہم نے غلط اور اُس کے برخلاف رائے کو جس کا بند رکھنا لوگ چاہتے تھے صحیح و درست فرض کیا تھا۔ اب اس کے برخلاف شق کو اختیار کرتے ہیں یعنی یہ فرض کرتے ہیں کہ رائے مروّجہ اور تسلیم شدہ صحیح ہے اور اُس کے برخلاف رائے جس کا بند کرنا چاہتے ہیں غلط اور نادرست ہے اور اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ اُس غلط رائے کا بھی بند کرنا خالی بُرائی اور نقصان سے نہیں۔ ہر ایک شخص کو گو اُس کی رائے کیسی ہی زبردست اور مضبوط ہو اور وہ کیسی ہی مشکل اور نارضامندی سے اپنی رائے کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرے یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ اگر اُس رائے پر بخوبی تمام اور نہایت بے باکی سے بے دھڑک مباحثہ نہیں ہو سکتا تو وہ ایک مُردہ اور مردار رائے قرار دی جاویگی نہ ایک زندہ اور سچی حقیقت اور وہ کبھی ایسی حق اور سچ بات قرار نہیں پا سکتی جس کا اثر ہمیشہ لوگوں کی طبیعتوں پر رہے۔

گذشتہ اور حال کے زمانہ کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ظالم گورنمنٹوں نے بھی نہایت سچی اور صحیح بات کی

رواج پر کوشش کی۔ اِلّا اُن کے ظلم نے اُس پر آزادی سے مباحثہ کی اجازت نہیں دی۔ اور بہت سی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ نیک اور تربیت یافتہ گورنمنٹ نے نہایت سچّی اور صحیح بات کا رواج دینا چاہا اور لوگوں نے یا تو اِس خیال سے کہ ہمارے مباحثہ اور دلائل کو اُس رائے میں کچھ مداخلت نہیں ہے یا کوئی التفات نہیں کرتا از خود مباحثہ کو نہیں اُٹھایا یا اپنے وہمی خوف سے یا اراکین گورنمنٹ کی بدمزاجی کے ڈر سے یا اُن کی خلاف رائے کے کوئی بات نہ کہنی مصلحت وقت سمجھ کر یا یہ خیال کر کر کہ گورنمنٹ کے یا کسی کے برخلاف بحث کرنا خیرخواہی نہیں ہے مباحثہ کو ترک کر دیا تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوا کہ اُس تجویز نے کسی کے دلوں میں مطلق اثر نہیں کیا اور ایک مردہ رائے سے زیادہ اور کچھ رُتبہ لوگوں کے دلوں میں نہیں پایا۔

یہ بات کہ سچّی اور درست رائے بے مباحثہ و دلیل کے بھی طبیعتوں میں بیٹھ جاتی ہے اور گھر کر لیتی ہے ایک خوش آیند مگر غلط آواز ہے دنیا کو دیکھو کہ گروہ کے گروہ ایک دوسرے کی متناقض رائے پر جمے ہوئے ہیں اور وہ متناقض رائیں اُن کے دلوں میں گھر کئے ہوئے ہیں پھر کیا وہ دونوں متناقض رائیں سچّی اور صحیح ہیں۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت سی باتیں بے سمجھے اور بغیر دلیل کے اور بغیر مباحثہ کے لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں مگر اُن کا صحیح و درست ہونا ضرور نہیں۔ سچ میں کوئی ایسی اعجازی کرامات نہیں ہے کہ وہ از خود

دلوں میں بیٹھ جاوے۔ اُس میں جو کچھ کرامات ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ مباحثہ کا اُس کو خوف نہیں۔ سچ رائے بھی اگر بلا دلیل و مباحثہ دل میں گھر کرے تو وہ سچی رائے نہیں کہلاویگی بلکہ تعصب اور جہل مرکب اُس کا مناسب نام ہوگا مگر ایسا طریقہ حق اور سچ بات کے قبول کرنے کا ایک ذیعقل مخلوق کے لئے جیسا کہ انسان ہے شایان نہیں اور نہ یہ طریقہ راستی و حق کے پہچاننے کا ہے بلکہ جو حق بات اِس طرح پر قبول کی جاتی ہے وہ ایک خیال فاسد اور باطل ہے اور جن باتوں کو حق فرض کر لیا ہے اُن کا اتفاقیہ قبول کر لینا ہے۔

نہایت سچ اور بالکل سچ تو یہ بات ہے کہ جس شخص نے جو رائے یا مذہب اختیار کیا ہے وہی شخص اُس کا جوابدہ ہے۔ اُس رائے کے موجد یا اُس مذہب کے پیشوا اور معلم اور مجتہد کچھ اُس کے ذمہ دار نہیں ہیں مگر مسلمانوں نے اِس آفتاب سے بھی زیادہ روشن مسئلہ سے آنکھ بند کر لی ہے اور رومن کیتھلک یعنی بت پرست عیسائیوں کا مسئلہ اختیار کیا ہے۔ رومن کیتھلک مذہب میں اُن لوگوں کے جو اُس مذہب پر ایمان رکھتے ہیں دو فرقے قرار دئے گئے ہیں۔ ایک تو وہ جو اُس مذہب کے مسائل کو بعد دلیل و ثبوت کے قبول کرنے کے مجاز ہیں اور دوسرے وہ جن کو صرف اعتماد اور بھروسہ یعنی تقلید سے اُن کا قبول کر لینا چاہئے۔ اسی قاعدہ کی پیروی سے مسلمانوں نے بھی اپنے مذہب میں دو فریق قائم کئے ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے مسئلہ مسلمہ کو بعد ثبوت و تحقیقات

اور اقامت دلیل تسلیم کیا ہے اور اُن کا نام باختلاف درجات مجتہد مطلق اور مجتہد فی المذہب اور مرجح قرار دیا ہے۔ دوسرا وہ جن کو بے سمجھے بوجھے آنکھ بند کر کر ان کی پیروی کرنی چاہئیے اور اُن کا نام مقلد اور اُس فعل کا نام تقلید قرار دیا ہے اور اس سبب سے مخالف کی مزاحمت مسلمانوں میں بہت زیادہ پھیل گئی ہے اور وہ اس کی نسبت ایک نہایت عمدہ مگر ابلہ فریب تقریر کرتے ہیں۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ تمام انسانوں کو اُن تمام باتوں کا جاننا نہ ضرور ہے اور نہ ممکن ہے جن کو بڑے بڑے حکیم یا اہل معرفت اور عالم علوم دین جانتے اور سمجھتے ہیں۔ اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ایک عام آدمی ایک ذکی اور دانشمند مخالف کی تمام غلط بیانیوں کو جانے اور اُن کو غلط ثابت کرے یا تردید کرنے اور غلط ثابت کرنے کے قابل ہو بلکہ صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اُن کے جواب دینے کے لائق ہمیشہ کوئی نہ کوئی موجود ہونگے جن کی بدولت مخالف کی کوئی بات بھی بلا تردید باقی نہ رہی ہو گی۔ بس سیدھی سادی عقل کے آدمیوں کے لئے یہی کافی ہے کہ اُن باتوں کی اصلیت سکھلا دی جاوے اور باقی وجوہات کی بابت وہ اوروں کی سند پر بھروسا کریں اور جبکہ وہ خود اس بات سے واقف ہیں کہ ہم اُن تمام مشکلات کے رفع دفع کرنے کے واسطے کافی علم اور پوری لیاقت نہیں رکھتے ہیں تو اس بات کا یقین کر کر مطمئن ہو سکتے ہیں کہ جو جو مشکلات اور اعتراض برپا کئے گئے ہیں وہ لوگ اُن سب کا جواب دے چکے ہیں یا آئندہ

دینگے جو بڑے بڑے عالم ہیں۔

اِس تقریر کو تسلیم کرنے کے بعد بھی رائے کی آزادی اور مخالف
رائے کی مزاحمت سے جو نقصان ہیں اُس میں کچھ نقصان نہیں لازم
آتا کیونکہ اس تقریر کے بموجب بھی یہ بات قرار پاتی ہے کہ آدمیوں کو
اِس بات کا معقول یقین ہونا چاہیئے کہ تمام اعتراضوں کا جواب حسب
اطمینان دیا گیا ہے اور یہ یقین جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ اُس پر
بحث و مباحثہ کرنے کی آزادی ہو اور مخالفوں کو اجازت ہو کہ تمام
اپنی وجوہات کو جو اُس کے مخالف رکھتے ہیں بیان کریں اور اُس
مسئلہ کو غلط ثابت کرنے میں کوئی کوشش باقی نہ چھوڑیں۔

اگر تقلید کی گرم بازاری کا جیسے کہ آج کل ہے اور آزادانہ مباحثہ
کی مزاحمت و عدم موجودگی کا نقصان اور بد اثر در صورتیکہ تسلیم شدہ
مسئلہ یا قرار دادہ رائیں صحیح ہوں اسی قدر ہوتا کہ اُس مسئلہ یا اُن
رایوں کی وجوہات معلوم نہیں ہیں تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ گو
وہ مزاحمت عقل و فہم کے حق میں مضر ہے مگر اخلاق کو تو اُس سے
کچھ مضرت نہیں پہنچتی اور نہ اُس مسئلہ کی یا رایوں کی اُس قدر و منزلت
میں کہ اُن سے نہایت عمدہ اثر لوگوں کی خصلتوں پر ہوتا ہے کچھ نقصان
ہے مگر یہ بات نہیں ہے بلکہ اُس سے بہت بڑھ کر نقصان ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مباحثہ اور آزادیٔ رائے کی عدم موجودگی میں
صرف مسئلہ یا رایوں کی وجوہات ہی کو لوگ نہیں بھول جاتے بلکہ اکثر

اُس مسئلہ یارائے کے معنی اور مقصود کو بھی بھول جاتے ہیں چنانچہ جن لفظوں میں وہ مسئلہ یارائے بیان کی گئی ہے اُن سے کسی رائے یا خیال کا قایم کرنا تک موقوف ہوجاتا ہے یا جو جو باتیں اُن لفظوں سے ابتداء میں مراد رکھی گئیں تھیں اُن میں سے بہت تھوڑی ہی معلوم رہ جاتی اور بعوض اس کے کہ اُس مسئلہ یارائے کا اعتقاد ہردم تر و تازہ اور زندہ یعنی موثر رہے اُس کے صرف چند ادھورے کلمے حافظہ کی بدولت باقی رہ جاتے ہیں اور اگر اُس کی مراد اور معنی بھی کچھ باقی رہتے ہیں تو صرف اُن کا پوست ہی باقی رہتا ہے اور مغز و اصلیت نابود ہوجاتی ہے - اب ذرا انصاف سے مسلمانوں کو اپنا حال دیکھنا چاہئے کہ تمام علوم معقول ومنقول میں اسی مزاحمت رائے یا تقلید کی بدولت اُن کا درحقیقت ایسا ہی حال ہوگیا ہے یا نہیں۔

اِس زمانہ تک جس قدر کہ انسانوں کو تمام مذہبی عقاید اور اخلاقی امور اور علمی مسائل میں تجربہ ہوا ہے اُس سے امر مذکورہ بالا کی صحت ثابت ہوتی ہے - چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ کسی مذہب یا علم یا رائے کے موجد تھے اُن کے زمانہ میں اور اُن کے خاص مریدوں یا شاگردوں کے دلوں میں تو وہ عقاید یا مسائل طرح طرح کے معنوں اور مرادوں اور خوبیوں سے بھرپور تھے اور اُس کا سبب یہی تھا کہ اُن میں اور اُن کے مخالف رائے والوں میں

اس غرض سے بحث و حجت رہتی تھی کہ ایک کو دوسرے کے عقیدہ اور
مسئلہ پر غلبہ اور فوقیت حاصل ہو مگر جب اُس کو کامیابی ہوئی اور
بہت لوگوں نے اس کو مان لیا اور بحث اور حجت بند ہوگئی اُس کی
ترقی بھی ٹھہر گئی اور وہ اثر جو دلوں میں تھا اُس میں بھی جان یعنی
حرکت اور جنبش نہیں رہی ایسی حالت میں خود اُس کے حامیوں کا
یہ حال ہوتا ہے کہ مثل سابق کے اپنے مخالفوں کے مقابلہ پر آمادہ
نہیں رہتے اور جیسے کہ اُس عقیدہ یا مسئلہ کی پہلے حفاظت کرتے تھے
ویسی اب نہیں کرتے بلکہ نہایت جھوٹے غرور اور بیجا استغنا سے سکون
اختیار کرتے ہیں اور حتی الامکان اُس عقیدہ اور مسئلہ کے برخلاف
کوئی دلیل نہیں سنتے اور اپنے گروہ کے لوگوں کو بھی کفر کے فتووں
کے ڈراوے سے اور جہنّم میں جانے کی جھوٹی دہشت دکھانے سے
سننے سے اور اُس پر بحث کرنے سے جہاں تک ہوسکتا ہے باز رکھتے
ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ کہیں علموں کی روشنی جو آفتاب کی روشنی کی
طرح پھیلتی ہے اور اعتراضوں کی ہوا اگر وہ صحیح ہوں تو کیا اُن کے
روکے رُک سکتی ہے اور جب یہ نوبت پہنچ جاتی ہے تو اس عقیدے
یا مسئلہ کا جن کو اُن کے پیشواؤں نے نہایت محنتوں سے قایم کیا تھا
زوال شروع ہوتا ہے اُس وقت تمام معلّم اور مقدّس لوگ جو اُس
کمبخت زمانہ کے پیشوا گنے جاتے ہیں اِس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ
معتقدوں کے دلوں میں اُن عقیدوں کا جن کو اُنہوں نے برائے نام

قبول کیا ہے کچھ بھی اثر نہیں پاتے اور باوجودیکہ وہ ظاہر میں اُن عقیدوں اور مسئلوں کو قبول کرتے ہیں مگر اُن کا ایسا اثر کہ اُن کے معتقدوں کا چال چلن اور اخلاق اور عادت اور معاشرت بھی اُن عقیدوں اور مسئلوں کے مطابق ہو مطلق نہیں پاتے۔ مگر افسوس اور نہایت افسوس کہ وہ معلم اور مقدس لوگ اتنا خیال نہیں فرماتے کہ یہ حال جو ہوا ہے جس کی وہ شکایت کرتے ہیں اُنہی کی عنایت و مہربانی کا نتیجہ ہے اب میں صاف کہتا ہوں اور نہایت بے دھڑک کہتا ہوں کہ یہ جو کچھ میں نے بیان کیا اس زمانہ کے مسلمانوں کے حال کا ٹھیک ٹھیک آئینہ ہے۔

اب اس حالت کے برخلاف حالت کو خیال کرو یعنی جبکہ آزادی رائے کی قایم رہتی ہے جس کے ساتھ مباحثہ کا بھی قایم رہنا لازم ملزوم ہوتا ہے اور ہر ایک حامی کسی عقیدہ یا علمی مسئلہ کا اپنے عقیدہ یا مسئلہ کی وجوہ کو قایم اور غالب رہنے پر بحث کرتا رہتا ہے۔ تو اُس وقت عام لوگ بھی اور سُست عقیدہ والے بھی اس بات کو خوب جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ہم کس بات پر لڑ بھڑ رہے ہیں اور ہمارے عقیدہ اور مسئلہ میں اور دوسروں کے عقیدہ اور مسئلہ میں کیا تفاوت ہے اور ایسی حالت میں ہزاروں ایسے آدمی پائے جاوینگے جنہوں نے اس عقیدہ یا مسئلہ کے اصول کو بخوبی خیال کیا ہوگا اور ہر ڈھنگ و طریقہ سے اُس کو خوب سمجھ بوجھ لیا ہوگا اور اُس کے عُمدہ عُمدہ پہلوؤں کو بخوبی جانچ

اور قول لیا ہوگا اور اُن کے اخلاق اور اُن کی عادت اور خصلت پر
اُس کا ایسا پورا پورا اثر ہوگا کہ جیسا کہ ایسے شخص کی طبیعت پر ہونا ممکن
ہے جس میں وہ عقیدہ یا مسئلہ بخوبی رچ بس گیا ہو۔ مگر جبکہ وہ عقیدہ
ایک موروثی اعتقاد ہو جاتا ہے اور لوگ باپ دادا یا اُستاد پیر کی رسم
متبرک کے طور پر قبول کرتے ہیں تو وہ تصدیق قلبی نہیں ہوتی۔ طبیعت
اُس کو مردہ دلی سے قبول کرتی ہے اور اس لئے طبیعت کا میلان اُس
عقیدہ اور مسئلہ کے بھلا دینے پر ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ عقیدہ یا مسئلہ
انسان کے باطن سے بے تعلق ہو جاتا ہے اور صرف اوپر ہی اوپر رہ جاتا
ہے اور تمام اخلاق اور عادات اُس کے برخلاف ہوتے ہیں اور ایسے ایسے
حالات پیش آتے ہیں جیسے کہ اس زمانہ میں اکثر پیش ہوتے رہتے ہیں
جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عقیدہ یا مسئلہ طبیعت کے باہر باہر رہتا
ہے اور بجائے اس کے کہ وہ دل میں گھر کرے باہر ہی باہر ایسے
خراب اور کانٹے دار پوست کی مانند لپٹا ہوا ہے جس کے سبب وہ
باتیں ظہور میں نہیں آتیں جو انسان کے عمدہ عمدہ اوصاف درونی
سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ اُس سے اِس قسم کی قوّت ظاہر ہوتی ہے جیسے
کانٹے دار تھوہڑ کے درخت کی باڑ سے ہوتی ہے کہ وہ نہ خود اُس
گھری ہوئی زمین کو کچھ فائدہ دیتا ہے اور نہ اور دل کو گل پھول
لیجا کر اُس میں لگانے دیتا ہے اور بجز اس کے کہ دل کی زمین کو
ہمیشہ خالی اور ویران اور بیکار پڑا رہنے دے اور کچھ نہیں کرتا۔

جو بات بیان ہوئی اُس کی صحت ہر ایک مذہب والا اپنے حال پر
غور کرنے سے بخوبی جان سکتا ہے ہر ایک مذہب والا اپنے مذہب میں
کسی نہ کسی کتاب کو مقدس سمجھتا ہے اور بطور قانون مذہب کے تسلیم
کرتا ہے مگر باایں ہمہ یہ بات کہنی کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ شائد ہزاروں
میں سے ایک اپنی چال چلن کی جانچ اور اس کے بُرے یا بھلے ہونے
کی آزمائش اُس مقدس تسلیم شدہ قانون کے بموجب کرتا ہو بلکہ
جس چیز کی سند اور پابندی پر وہ کام کرتے ہیں وہ صرف اپنی قوم یا
فرقے یا مذہبی گروہ کا رسم ورواج ہوتا ہے نہ اور کچھ۔ پس حقیقت
میں یہ حال ہوتا ہے کہ ایک طرف تو وہ اخلاقی مسائل کا مجموعہ ہوتا ہے
جس کی نسبت وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اُن کی زندگی کے عملدرآمد
کے لئے خدا نے بنایا ہے یا کم سے کم کسی نہایت نیک اور دانا عاقل نا
قابل سہو وخطا شخص نے بنایا ہے اور دوسری طرف اُن رسم ورواج
اور معتقد رایوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو اُس قوم یا فرقہ یا گروہ میں مروّج
ہوتی ہیں اور اس پچھلے مجموعہ کی بعض باتیں اُس پہلے مجموعہ کے بالکل
مطابق ہوتی ہیں اور بعض کچھ مطابق اور بعض بالکل برخلاف۔ اور مذہب کا
اعتقاد رکھنے والے اُس پہلے مجموعہ کی زبانی تصدیق تو بلاشبہ کرتے ہیں
الّا اصلی اطاعت اور رفاقت اور پابندی اُس پچھلے مجموعہ کی کرتے
ہیں جس پر روزمرہ اُن کا عمل ہوتا ہے اور جسکا ترک کرنا اس کے برخلاف
کوئی کام کرنا نہایت ننگ وعار جانتے ہیں۔ پس یہ بیقدری جو اُس

پہلے مجموعہ کے مسائل کی ہو گئی جس کو وہ خدا کا بتایا ہوا جانتے تھے۔ اسی
بات سے ہو گئی کہ اُس کے مسائل اور اصول پر مباحثہ بند
ہو گیا اور اس سبب سے انسان کے باطن سے بے تعلق ہو گیا اور
بجائے زندہ عقیدہ کے صرف بطور مُردہ عقیدہ کے لوگوں کے
خیال میں رہ گیا۔

اِس تقریر پر جو بہت بڑا اور نہایت سخت اعتراض وارد ہو سکتا
ہے وہ یہ ہے کہ صحیح اور درست علم یا تجربہ حاصل کرنے کے لئے کیا
یہ بات ضرور ہے کہ کبھی رایوں میں اتفاق نہ ہو بلکہ ضرور ہے کہ چند
آدمی غلطی پر مصر رہیں تاکہ مباحثہ قائم رہے اور اور لوگ اُن کی بدولت
حق بات حاصل کر سکیں کیا دنیا میں غلطیوں کا موجود رہنا صحیح رایوں
کے حاصل کرنے کے لئے لابُد ہے جبکہ کسی عقیدہ یا علمی مسئلہ کو عموماً تسلیم
کر لیا جاوے تو کیا اُس کی حقیقت بدل جاتی ہے اور اُس کی تاثیر
جاتی رہتی ہے اور کیا کسی مسئلہ یا عقیدہ کا اُس وقت تک اثر نہیں
ہوتا یا لوگ اُس کو بخوبی نہیں سمجھتے جب تک کہ کوئی اُس پر شبہ نہ کرتا رہے
جبکہ انسان کسی حق بات کو بالاتفاق قبول کر لیتے ہیں تو کیا اس کی
حقانیت معلوم ہو جاتی ہے۔ اب تک یہ خیال کیا گیا ہے کہ علم اور عقل
کی ترقی کا عمدہ مقصد اور اعلےٰ نتیجہ یہ ہے کہ تمام انسان اچھی اچھی اور
عمدہ عمدہ باتوں میں متفق الرائے ہو دیں اور وہ اتفاق رائے
روز بروز زیادہ بڑھتا جاوے پھر کیا علم اور عقل اُس وقت تک باقی

رہتی ہے جب تک کہ اُس کا مقصد اور اُس کا نتیجہ حاصل نہ ہو یہ تو
سُنا گیا تھا کہ ہر بات کا کمال اُس کے مقصد اور نتیجہ کا حاصل ہونا ہے
مگر یہ نہیں سُنا تھا کہ مقصد اور نتیجہ کا حاصل ہونا ہی اُس کا زوال ہے۔

مگر میرا مقصد یہ نہیں ہے جو اس اعتراض میں بیان ہوا۔ میں قبول
کرتا ہوں کہ بلاشبہ جس قدر انسانوں کی ترقی اور تہذیب ہوگی اُسی قدر
مختلف فیہ رائیں اور مسئلے اور عقیدے گھٹتے جاوینگے بلکہ آدمیوں کی
بہبودی اور بھلائی کا اندازہ بالتخصیص اُنہی حقایق کی تعداد اور مقدار
سے ہو سکتا ہے جو غیر متنازعہ فیہ یا حقائق محققہ کے مرتبہ کو پہنچ جاتی ہیں
اور اُس کے استحکام کے لئے انسانوں کی رایوں کا اجتماع اور اتفاق
ضروری شرطوں میں سے ہے اور وہ اجتماع اور اتفاق جیسا کہ غلط
رائے پر ہونا نہایت مضر ہے ویسا ہی صحیح رائے پر ہونا نہایت مفید ہے
مگر جبکہ ہم کو غلط رایوں پر بھی اجتماع اور اتفاق ہو جانے کا اندیشہ
ہے تو ہم کو اُس سے بچنے کی فکر و تدبیر سے غافل رہنا نہیں چاہئیے
اور وہ تدبیر یہی ہے کہ آزادئ رائے اور مباحثہ جاری رہے۔ اگر
اس تدبیر کے قائم رہنے کا بسبب عموماً تسلیم ہو جانے اُس مسئلہ یا
عقیدہ کے موقع نہ رہے تو ہم کو اُس کی جگہ کوئی اور تدبیر قائم کرنی
چاہئیے۔ سقراط نے اسی تدبیر کے لئے فرضی مباحثہ کا طریقہ ایجاد کیا تھا
جس کو افلاطوں نے نہایت خوبی سے اپنے سوال و جواب میں
بیان کیا ہے۔

مگر افسوس ور ہزار افسوس کہ اس زمانہ کے مسلمانوں نے بجائے
اس کے کہ اُس تدبیر کے قایم رکھنے کا کوئی طریقہ ایجاد کریں اُن تدبیروں
کو بھی ضایع کر دیا جو سابق میں ایجاد ہوئی تھیں۔ مسلمانوں میں ہر ایک
علم کی تحصیل کا مدت سے یہ حال رہ گیا ہے کہ سب کے سب کیا قصہ
اور کہانی کی کتابوں کو اور کیا تاریخ اور واقعات گذشتہ کے روزناچوں کو
اور کیا لوٹے پھوٹے اگلے زمانہ کے جغرافیہ کو اور کیا بولی بنجی انسان
کے بدن کی تشریح کو اور کیا دقیانوسی بطلیوسی ہیئت اور قدیم ریاضی
کو اور کیا انسانوں کے اجتہادیات مسائل دینی کو جس کو علم فقہ کہا جاتا
ہے اور کیا علم حدیث اور تفسیر کو اس ارادہ سے مطلق نہیں پڑھتے کہ ہم کو
اُس کی اصلیت اور حقیقت معلوم ہو بلکہ صرف یہ ارادہ ہوتا ہے کہ
جو کچھ اُس کتاب میں لکھا ہے خواہ غلط خواہ صحیح وہ ہم جان لیں۔ اگر
مباحثہ کیا جاوے تو نہ اس بات پر کہ وہ اصول جو اُس کتاب میں لکھے
ہیں صحیح ہیں یا غلط۔ بلکہ اس بات پر کہ اس کتاب میں یہی بات
لکھی ہے یا نہیں۔ اِس طریقہ اور عادت نے آزادیٔ رائے کو کھو دیا
اور اُس سیرت کو جس سے غلطی میں پڑنے سے حفاظت تھی توڑ دیا
اُن کے تمام علم و فضل غارت ہو گئے۔ اُن کے باپ دادا کی کمائی
جس سے توقع تھی کہ اُن کی اولاد فائدہ اُٹھاویگی سب ڈوب گئی اب
جو بڑے بڑے عالم فقیہ اور دانا رہ گئے ہیں اُن کا یہ حال ہے کہ کسی
چیز کی حقیقت سے کیا مسائل علمی اور کیا عقاید مذہبی میں کچھ بھی واقفیت

نہیں رکھتے۔ جس شخص سے کسی بات کی حقیقت پوچھو اگر وہ بڑا ہی عالم ہے تو بجز اِس کے کہ فلاں شخص نے یہ لکھا ہے اور کچھ نہیں بتا سکتا۔ تمام علوم کا مزہ اور تمام عقیدوں کا اثر دِل سے جاتا رہا۔ پس آزادیِ رائے کے قایم نہ رہنے کے یہ عمدہ اثر ہیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

آزادیِ رائے کے غیر مفید ہونے کے ثبوت میں یہ بات اکثر پیش کی جاتی ہے کہ آزادی رائے سے جس کے ساتھ مباحثہ لازم و ملزوم ہے کسی رائے کے حق یا ہیچ ہونے کا فیصلہ ممکن نہیں بلکہ ہر ایک فریق کو اپنی اپنی رائے پر اور زیادہ پختگی اور اصرار ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس بات کا اقرار کرتا ہوں۔ اور اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ درحقیقت تمام رایوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ خاص خاص فرقوں کی رائیں ہو جاتی ہیں بحث و مباحثہ کی کمال آزادی سے بھی اُس کا کچھ تدارک نہیں ہو سکتا بلکہ اُس سے اور زیادتی ہوتی جاتی ہے اور حق کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ بعوض اِس کے کہ لوگ اُس کو سمجھیں اور بوجھیں اس وجہ سے اُس کو بغیر سوچے سمجھے بلکہ بے سوچے اور سمجھے نہایت زور شور سے رد کرتے ہیں کہ وہ ایسے لوگوں کا قول ہے جن کو وہ اپنا مخالف جانتے ہیں یا اُن سے نفرت رکھتے ہیں۔ مگر یہ بھی خوب جان لینا چاہئے کہ آپس میں رایوں کے اختلاف اور مباحثہ سے اُنہی متعصب گروہوں کو جن کے باہم بحث ہوتی ہے چنداں فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اُس کا عمدہ اور مفید اثر اُن لوگوں پر

ہوتا ہے جو اُس کے دیکھنے سُننے والے ہیں اور جن کی طبیعتوں میں وہ جذبہ وحرارت اور خود غرضی اور طرفداری نہیں ہوتی جیسے کہ اُن مخالف فریقوں کے حامیوں میں ہوتی ہے اور جبکہ رفتہ رفتہ ان متعصبوں کی بھی حرارت کم ہو جاتی ہے تو جو حق بات ہے وہ اُس کے صحیح ہونے کا اقرار اپنے دل میں یا اپنے خاص دوستوں میں چُپکے چُپکے کرنے لگتے ہیں گو کہ علانیہ کبھی اُس کا اقرار نہ کریں۔

سچ بات پر سخت سے سخت نزاع کا ہونا کچھ بُرائی یا نقصان کی بات نہیں بلکہ اُس کا انسداد بہت بڑے نقصان کی بات ہے جبکہ لوگ طرفین کے دلائل سُننے پر مجبور ہوتے ہیں تو ہمیشہ انصاف کی اُمید ہوتی ہے۔ مگر جبکہ وہ صرف یک طرفہ بات سنتے ہیں تو اُس صورت میں غلطیاں سختی پکڑ کر تعصب بن جاتی ہیں اور سچ میں بھی سچ کا اثر اس لئے باقی نہیں رہتا کہ اُس میں مبالغہ ہوتے ہوتے وہ خود ایک جھوٹ بن جاتا ہے۔ انصاف کی قوت جو انسان میں ہے وہ اُسی وقت بخوبی کام میں آتی ہے کہ ہر ایک معاملہ کے دونوں پہلوؤں کے حامی اور معاون تصفیہ کے وقت روبرو موجود ہوں اور وہ دونوں ایسے زبردست ہوں کہ اپنے اپنے دلائل اور وجوہات کی سماعت پر لوگوں کو گویا مجبور کر دیں اور سوائے اِس کے اور کوئی صورت حق کے حاصل کرنے کی نہیں ہے۔

رائے کی آزادی پر ایک اور چیز جس کو لوگ سند کہتے ہیں کبھی کبھی

مزاحمت پہنچاتی ہے یہ اکثر ہوتا ہے کہ بحث کرنے والے اپنی اپنی تقریر
کی تائید میں کسی مشہور شخص کے قول کی سند لاتے ہیں حالانکہ کسی شخص
کی سند پر اپنی رائے کو منحصر رکھنا خود آزادیٔ رائے کے برخلاف چلنا ہے
اگر ہم کسی کے قول کو صحیح اور سچ سمجھتے ہیں تو اُس کے قول کو پیش کرنا کچھ
مفید نہیں ہے بلکہ ہم کو وہ دلیلیں پیش کرنی چاہئیں جن سے اُس قول کو
ہم نے صحیح مانا ہے۔ اگر سقراط و بقراط نے کوئی ایسی بات کہی ہے جو
درحقیقت صحیح نہیں ہے تو وہ اُن کے کہنے سے صحیح نہیں ہو جانے کی اور
اگر کسی جاہل نے کوئی صحیح بات کہی ہے تو وہ اِس لئے کہ کسی جاہل
نے کہی ہے غلط نہیں ہو جانے کی کیا عمدہ مسئلہ ہے جس پر ہر انسان کو
عمل کرنا چاہیئے مگر افسوس کہ اُس پر نہایت کم عمل ہوتا ہے اور وہ
مسئلہ یہ ہے :-

فانظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ من قال واللہ در من قال

مرد باید کہ گیرد اندر گوش　　در نوشت است پند بر دیوار

(سر سید)

عقاید مذہب اسلام

عقیدۂ اول

تمام موجودات کا خالق یا اُن کے وجود کا سبب اخیر یا علت العلل کوئی

ہے اور اُسی کا نام ہے اللہ۔

مذہب اسلام کا سب سے پہلا یہ عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا کوئی خالق ہے۔ یہ سب کچھ جو موجود ہے اور جس کو ہم کسی طرح جان سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں یا خیال کر سکتے ہیں ایک ایسے سلسلہ سے مربوط ہے کہ ایک کا وجود دوسرے پر اور دوسرے کا تیسرے پر منحصر ہے۔ پس ضرور ہے کہ یہ سلسلہ کسی اخیر وجود یا علت یا سبب پر منتہی ہو اور جس پر یہ منتہی ہو وہی خالق اور خدا اور ربّ العالمین ہے۔

اِس بات پر یقین نہیں ہو سکتا کہ یہ سب کچھ جو موجود ہے خود آپ ہی اپنے وجود کی اخیر علت ہے۔ اگر موجودات میں سے ہر چیز اپنے وجود میں کسی دوسرے وجود کی محتاج نہ ہوتی یا کسی کا وجود کسی دوسرے وجود کا معلول نہ ہوتا تو شاید ہم ایسا یقین کر سکتے مگر جبکہ ہر ایک چیز کو کسی علت کا معلول پاتے ہیں تو انہی چیزوں کے مجموعہ کو کس طرح کسی علت العلل کا معلول نہ سمجھیں۔

تمام چیزیں جو بوجود حقیقی موجود ہیں نہ ممتنع ہیں نہ قابل عدم۔ اگر وہ ممتنع ہوتیں تو موجود کیوں ہوتیں اور اگر قابل عدم ہوتیں تو کبھی غیر موجود بھی ہوتیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی موجود حقیقی کبھی معدوم نہیں ہوتا صرف عوارض یا صور کا تبدل ہوتا رہتا ہے۔ پانی ہوا ہو جاتا ہے ہوا پانی بن جاتی ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جو مٹی ہو جاتی ہیں اور پھر مٹی سے عجیب

عجیب چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ غرضکہ کوئی شئے معدوم نہیں ہوتی صرف عوارض یا صورت کا ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر تمام موجودات کے عوارض نوعیہ یا شخصیہ معدوم ہو جاویں تو جو کچھ باقی رہیگا وہ ناقابل عدم ہوگا۔ وقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔

بلاشبہ اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ تمام موجودات کے عوارض نوعیہ و شخصیہ کے معدوم ہونے کے بعد جو وجود ناقابل عدم باقی رہیگا وہ کیا ہے اور وہ ایک ہوگا یا کئی۔ مگر اس بات کے فیصل نہ ہونے سے خالق کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اُس ناقابل عدم موجود کی حقیقت کو یا اُس کی وحدت و کثرت کو خالق کے وجود کے ہونے یا نہ ہونے سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

اگر وہ متعدد ہوں تو البتہ یہ سوال کرنا پڑیگا کہ قبول عوارض کی قوت خود اُنہی میں ہے یا کسی دوسرے موجود سے ہے۔ خود اُنہی میں تو ہم اس لئے نہیں مانتے کہ جب ہم تمام موجودات کو مع عوارض نوعیہ و شخصیہ دیکھتے ہیں تو ایک کو دوسرے کا معاون پاتے ہیں۔ پس اُن موجودات کے عوارض نوعیہ شخصیہ کے معدوم تصور کرنے کے بعد جو متعدد وجود ناقابل عدم باقی رہینگے ضرور وہ بھی ایک دوسرے کے معاون ہونگے۔ مگر اُن کے ایسا ہونے کے لئے بلا کسی علت مشترک کے کوئی وجہ نہیں ہے۔ اب کچھ شبہ نہیں رہتا کہ اُن میں اُس معاونت کی علت

مشترک کوئی اور وجود ہو اور اُسی وجود کو ہم کہتے ہیں اللہ۔
اور اگر وہ واحد ہو تو یہ سوال ہوگا کہ قبول عوارض کی قوت خود اُسی میں ہے یا کوئی دوسرا وجود اُس کی علّت ہے۔ اگر اُسی میں ہو تو اُسی کا نام اللہ ہے۔ اور اگر دوسرا وجود اُس کی علّت ہو تو اُسی علۃ العلل کا نام اللہ ہے۔

کبرائے اسلام کی رائے اس میں مختلف رہی ہے۔ اکثر کہتے ہیں کہ اُسی وجود ناقابل عدم میں دونوں قوتیں فعل و انفعال کی یعنی جس کو قوت قبول عوارض کہتے ہیں موجود ہیں اور اسی سبب سے وہ لوگ وحدت وجود کے قایل ہیں اور یوں کہتے ہیں۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ
خود بر سر بازار خریدار برآمد ۔ بشکست و رواں شد

اور بعضے کہتے ہیں کہ اُس قوت انفعال کی علّت دوسرا وجود ہے اور اِس سبب سے وہ لوگ وحدت شہود کے قایل ہیں مگر اصل یہ ہے کہ

آں برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

بہرحال اِن دونوں مسئلوں میں کوئی سا مسئلہ صحیح ہو اس اصلی مسئلہ میں کہ تمام موجودات کا کوئی خالق ہے کسی طرح کا تبدّل نہیں آتا۔
وحدت شہود کے مسئلہ کو لوگوں نے کفر جانا ہے۔ وہ اِس دھوکے میں پڑے ہیں کہ اس وجود ناقابل عدم کو بھی جس میں اُس قوت انفعال کی

علت دوسرا وجود مانا ہے ازلی وابدی ماننا پڑیگا جو ٹھیک شرک ہے یا اُن کا مذہب ہے جو خدا اور مادہ دو چیزوں کو ازلی وابدی مانتے ہیں اور بعضے اُسی کو ظلمت اور نور سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر یہ اُن لوگوں کی سمجھ کی غلطی ہے کیونکہ معلول کا وجود علّت کے وجود کے ساتھ لازم وملزوم ہے۔ مگر جب معلول کا وجود علّت کے وجود کے سبب سے ہے تو شرک کہاں رہا۔ علّت ازلی وابدی کا معلول بھی ازلی وابدی ہے ہم تم بھی جبکہ علت ازلی وابدی کے معلول ہیں تو ازلی وابدی ہیں۔ تم بھی ازلی وابدی ہو۔ ہم بھی ازلی وابدی ہیں ؎

مخلوق شدیم و با خالق گشتیم
جائیکہ خدا بود ما ہم بودیم

پس انہی موجودات کے وجود سے ہم خالق پر یقین کرتے ہیں۔
اِس پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ تو یقین نہیں ہے بلکہ ایک خیال ہے جس کا تجربہ نہیں ہوا اور خیال کے مفہوم میں امکان اس بات کا کہ بعد تجربہ کے وہ مطابق واقع کے ہو یا نہ ہو دونوں داخل ہیں ہم نے اِس خیال کا تجربہ نہیں کیا پھر اس کے مطابق واقع ہونے پر کیونکر یقین ہوسکتا ہے۔

یہ کہنا سچ ہے مگر ہمارے خیالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو خود ہماری طبیعتوں نے پیدا کیا ہو یا اسباب غیر محققہ خیالیہ سے ہم میں پیدا ہوئے ہوں۔ بلاشبہ اِس قسم کے خیال کے

مفہوم میں امکان اِس بات کا کہ بعد تجربہ کے مطابق واقع کے ہو یا نہ ہو داخل ہے۔ مگر ہمارے خیالات جو دوسری قسم کے ہیں جن کو نہ از خود ہماری طبیعتوں نے پیدا کیا ہے اور نہ وہ اسباب غیر محققہ خیالیہ سے ہم میں پیدا ہوئے ہیں بلکہ اُن کو کسی دوسرے حقائق محققہ نے پیدا کیا ہے وہ ہمیشہ ہوتے ہیں اور بالکل مطابق واقع کے بعد تجربہ کے۔ جبکہ ہم سنتے ہیں ایک آواز یا دیکھتے ہیں ایک دھواں تو ہم خیال کرتے ہیں کہ وہاں ہے ایک آواز کرنے والا یا وہاں ہے ایک آگ۔ ہمارا ایسا خیال کرنا بھی ایک خیال ہے مگر اس قسم کا نہیں ہے جو از خود ہماری طبیعت میں آگیا ہو یا اسباب غیر محققہ خیالیہ نے ہم میں پیدا کیا ہو بلکہ ایک ایسا خیال ہے جس کو دوسرے حقایق محققہ نے پیدا کیا ہے۔ ہمارا ایسا خیال ہمیشہ ہوتا ہے ٹھیک اور بعد تجربہ کے بالکل مطابق واقع کے اگر ہم نے خود اُس چیز میں جس نے ہم میں ایسا خیال پیدا کیا۔ کچھ غلطی نہ کی ہو۔

جبکہ ہم پاتے ہیں چند چیزوں کو ایک جگہ ترتیب سے رکھا ہوا یا خوبصورت بنا ہوا تو ہم یقین کرتے ہیں کہ اُن کا کوئی رکھنے والا یا بنانے والا ہے۔ پھر جب ہم دیکھتے ہیں اس تمام موجودات کو ایسی عمدہ ترتیب سے رکھا ہوا اور ایسی حکمت سے بنا ہوا اور ایسی خوبصورتی سے ڈھلا ہوا تو یقین کرسکتے ہیں کہ کوئی ان کا ترتیب دینے والا اور بنانے والا ہے جبکہ ہم ایک پتھر کو جو رستہ میں پڑا ہوا ہے دیکھ کر یقین کرتے ہیں کہ

اُس کو کسی نے یہاں ڈالا ہے تو ہم کیونکر اس بات پر یقین نہ کریں کہ اِن سب چیزوں کو بھی جو انسان کی قدرت سے باہر ہیں کسی بڑے دانا کاریگر نے بنایا ہے اور اُسی کاریگر کو ہم کہتے ہیں خدا۔

یہ خیال ہمارا جو خدا کے ہونے پر ہوا ہے اُس کو ایسی چیزوں نے پیدا کیا ہے جو ایک حقیقت ہیں یا یوں کہو کہ جو حقایق محققہ ہیں اور ہم نے اس قسم کے خیال کو ہمیشہ ٹھیک اور بعد تجربہ کے مطابق واقع کے پایا ہے اس لئے ہم خیال پر بھی یقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعد تجربہ کے بھی جب کبھی کہ ہو یہ ہمارا خیال بالکل مطابق واقع کے ہوگا اور اسی لئے ہم اس کو خیال نہیں کہتے بلکہ یقین کہتے ہیں۔

پس یہ تمام موجودات عام عقل انسانی کے لئے بخوبی اس بات کی رہنما ہیں کہ اُن کا کوئی خالق ہے اور اس لئے وجود خالق پر ایمان لانے کا ایسا مسئلہ ہے کہ عام عقل انسانی اُس کو بخوبی سمجھ سکتی ہے اور اسی سبب سے انسان اُس پر ایمان لانے کو مکلف ہوا ہے۔ اگر یہ مسئلہ عقل انسانی میں آنے کے یا یوں کہو کہ انسان کی سمجھ کے لایق نہ ہوتا تو انسان ہرگز اس مسئلہ پر ایمان لانے کو مکلّف نہ کیا جاتا۔ کما قالَ اللّٰہ تعالےٰ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔

بانئے اسلام کا یہ منشاء نہیں ہے کہ وجود صانع کا مسئلہ انسان بغیر سمجھے مان لیں یا اس وجہ سے اُس کو تسلیم کرلیں کہ پیغمبروں نے

فرمایا ہے۔ بلکہ بانئ اسلام صاف صاف انہی موجودات کی دلیلوں سے اور نیچر یعنی قدرت اور فطرت کے عجائبات کو بتلا بتلا کر اور دکھلا دکھلا کر وجود صانع پر ایمان لانے کو کہتا ہے۔

کس پیاری اور سچی زبان سے فرمایا ہے کہ "اُسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اب تم انسان ہو جا بجا پھیلے ہوئے۔

"اُسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تم ہی سا جوڑا پیدا کیا تاکہ اُس سے دل کو چین رہے اور ایک عجیب قسم کی محبت اور دل کی پگلاہٹ تم میں رکھی سمجھنے والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔"

اُسی کی نشانیوں میں ہے آسمان و زمین کا پیدا کرنا۔ تمہاری بولیوں کا تمہاری رنگتوں کا مختلف ہونا اس بات میں تمام دنیا کے لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔"

اُسی کی نشانیوں میں سے رات کو تمہارا سو رہنا اور دن کو روٹی کے دھندے میں لگنا۔"

"اُسی کی نشانیوں میں سے بجلی بھی ہے جس میں کڑک کا خوف اور مینہ کی طمع ہے کہ پانی برسنے سے مری ہوئی زمین زندہ ہو جاتی ہے۔"

"اُسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اُسی کے حکم سے تھمے ہوئے ہیں۔"

وہی اللہ ہے جو ہوا کو چلاتا ہے۔ پھر اُس سے بادلوں کو

ہنکاتا ہے۔ پھر تمام آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلا دیتا ہے۔ پھر اُن کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن میں سے بوندیاں نکلتی ہیں۔

"وہ آسمان سے اندازہ کے موافق مینہ برساتا ہے۔ پھر اُس کو زمین میں ٹھہراتا ہے۔ پھر اُس کے سبب سے تمہارے لئے باغوں میں بہت سے میوے اور کھجوریں اور انگور پیدا کرتا ہے جن کو تم کھاتے ہو پہاڑ میں سے درخت اُگاتا ہے جس میں سے تیل نکلتا ہے"

"تمہارے لئے تو جانوروں میں بھی بڑی نصیحت ہے۔ اُن کی چھاتیوں میں سے جو کچھ نکلتا ہے اُس کو پیتے ہو اور بہت سے فائدے اُٹھاتے ہو بعضے جانور تمہارے کھانے میں آتے ہیں۔ جانور بھی تم کو اُٹھائے پھرتے ہیں اور کشتیاں بھی تم کو اُٹھا کر لیجاتی ہیں"

"زمین پر کس حکمت سے پہاڑ بنائے ہیں تاکہ وہ تُلی رہے پھر اُن میں گھاٹیاں بنائی ہیں تاکہ رستہ چلنے میں حرج نہ ہو"

"اُسی نے بنائی ہے رات اور دن۔ سورج اور چاند جو اپنے اپنے گھیرے میں پھرتے ہیں"

"تم اُونٹ ہی کو کیوں نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب طور سے بنایا ہے اور آسمان کو کس طرح اونچا کیا ہے اور پہاڑوں کو کس طرح پر گاڑا ہے اور زمین کو کس طرح پر بچھایا ہے"

"غرضکہ اسی طرح جابجا قرآن مجید میں بانئے اسلام نے صانع کے وجود پر ایمان لانے کو تمام موجودات سے جس کو ہم دیکھتے ہیں استدلال

کیا ہے اور کسی جگہ یہ بات نہیں فرمائی کہ تم بے سمجھے خدا پر ایمان لے آؤ"
ایک جگہ فرماتا ہے کہ "اگر کافروں سے بھی یہ بات پوچھو کہ
آسمان و زمین کس نے بنایا اور چاند و سورج کو کس نے تابعدار کیا تو
کہینگے اللہ نے"
"اور اگر اُن سے پوچھو کہ کس نے آسمان پر سے مینہ برسایا جس سے
مری ہوئی زمین کو پھر زندہ کیا تو کہینگے اللہ نے"
پس مذہب اسلام کا کیا سچا مسئلہ ہے کہ تمام انسانوں کو جنگلی
ہوں یا پہاڑی۔ شہری ہوں یا دیہاتی۔ تربیت یافتہ ہوں یا نا تربیت
یافتہ۔ کسی نبی کی اُن کو خبر پہنچی ہو یا نہ پہنچی ہو۔ کوئی مذہب اُن کو دیا
گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو اِس بات پر ایمان لانا فرض ہے کہ تمام موجودات
کا کوئی صانع ہے اور وُہی ہے اللہ جل شانہ وجلّ جلالہ۔

عقیدۂ دوم

وہ ہستی جس کو ہم اللہ کہتے ہیں واحد فی الذات ہے یعنی مثل
اُس کے دوسری ہستی نہیں۔
تمام موجودات پر جب ہم نظر کرتے ہیں تو بادی النظر میں ہم کو
عجیب مختلف قسم کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایک
کو دوسری سے کچھ تعلق نہیں۔ مگر جب بہ تعمق نظر ڈالتے ہیں اور بخوبی
سوچتے ہیں اور حقائق قدرت پر بقدر طاقت بشری واقفیت حاصل

کرتے ہیں تب سمجھتے ہیں کہ تمام موجودات آپس میں نہایت مناسبت
رکھتی ہے اور سب کی سب ایک راہ پر چلتی ہے ایک کو دوسری سے
ایسی مناسبت ہے کہ اگر ایک چیز بھی موجودات میں سے معدوم ہو جاوے
تو اُس گورکھ دھندے میں اُتنا ہی نقصان آجاوے۔

تمام موجودات ایسی تدبیر و حکمت و مناسبت سے موجود ہے جیسے
ایک گھڑی یا کل کے مختلف پرزے آپس میں مناسبت رکھتے ہیں
اور اس سے ہم کو اِس بات کی ہدایت ہوتی ہے کہ یہ گورکھ دھندا
ایک ہی دانا حکیم کا نکالا ہوا اور ایک ہی کاریگر کا بنایا ہوا ہے۔
اور تمام عقل انسانی اس دلیل سے خدا کی واحدانیت پر اقرار کر سکتی
ہے اس لئے اس مسئلہ پر بھی ایمان لانا اُسی طرح ہر ایک انسان کو
فرض ہے جس طرح کہ وجود خالق کے مسئلہ پر ایمان لانا فرض تھا۔

بلا شبہ یہ مسئلہ بہ نسبت پہلے مسئلہ کے کسی قدر زیادہ باریک ہے
جو لوگ کہ نیچرل فلاسفی یعنی علم طبیعیات سے زیادہ واقف ہیں اور
جنھوں نے موجودات عالم میں سے بہت سی چیزوں کی بناوٹ اور
پیدائش اور پھر اُن کے انقلاب کا بقدر طاقت بشری علم حاصل
کیا ہے اُن کا یقین اِس مسئلہ پر سب سے زیادہ پختہ اور مستحکم ہے
اُن سے کم درجے کے لوگوں کو خود کسی قدر غور و فکر کی حاجت ہوتی ہے
اور اُس سے ادنےٰ درجہ کے لوگ دوسرے کی تنبیہ سے متنبہ ہونے
اور کسی سے اُس کا بیان سننے کے محتاج ہوتے ہیں۔ مگر یہ مسئلہ

ایسا نہیں ہے کہ عام عقل انسانی کی سمجھ سے باہر ہو تحقیقات کامل سے خواہ خود سوچنے سے یا کسی کے سمجھانے سے انسان اُس کو بخوبی سمجھ سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اِس مسئلہ پر ایمان لانا بموجب مذہب اسلام کے تمام انسانوں پر فرض ہے۔ بلکہ اسلام نے بھی اِس مسئلہ کو کارخانہ قدرت کی دلیل سے سمجھایا ہے اور کسی جگہ بغیر سمجھے ایمان لانے کو نہیں فرمایا۔

ایک جگہ فرمایا ہے "اُسی کا ہے جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اور جو اُس کا ہے (یا اُس کے پاس ہے) اُس کی اطاعت سے نہ منحرف ہوتا ہے اور نہ تھکتا ہے۔ رات دن اُسی کی بزرگی یاد کرتا ہے اور ذرا بھی سستی نہیں کرتا۔ کیا اُنہوں نے زمین کی چیزوں میں سے کسی کو خدا ٹھہرایا ہے۔ اگر آسمان و زمین میں بہت سے خدا ہوتے تو دونوں کا کارخانہ بگڑ جاتا۔"

ایک اور مقام پر بانئے اسلام نے اس سے بھی زیادہ فصیح و مؤثر زبان سے نیچر سے خدا کی وحدانیت پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ کس نے پیدا کیا آسمان اور زمین اور کس نے برسایا تمہارے لئے مینہ۔ پھر اُس سے نہایت پُر رونق باغ اُگائے۔ تم کو تو اُن کے اُگانے کی قدرت نہ تھی پھر کیا خدا کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہے؟"

کس نے زمین کو تمہارے رہنے کی جگہ بنایا اور کس نے اُس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور کس نے اُس پر پہاڑ گاڑے اور کس نے

دو سمندروں کے بیچ میں زمین کا پردہ پیدا کیا۔ پھر کیا خدا کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہے"۔

"کون تم کو اندھیرے جنگلوں میں اور سمندر میں رستہ بتاتا ہے۔ کون مینہ برسنے سے پہلے اپنی مہربانی کی خوشخبری دینے والی ٹھنڈی ہوا چلاتا ہے پھر کیا خدا کے ساتھ کوئی دوسرا خدا ہے اگر تم سچے ہو تو اس کی دلیل لاؤ"

پس دیکھو کہ کس طرح بانیٔ اسلام نے توحید کا مسئلہ صرف کارخانۂ قدرت کی حکمت اور اس کی مناسبت سمجھا کر انسانوں کو سمجھایا ہے یہ نہیں کہا کہ خواہ نخواہ بے سمجھے خدا کو ایک مان لو اور جبکہ یہ مسئلہ ایسا تھا کہ ہر ایک انسان اس کو سمجھ سکتا تھا اس لئے بانیٔ اسلام نے تمام انسانوں کو اس مسئلہ پر ایمان لانیکا مکلف کیا اور کہدیا کہ تعالی اللّٰہ عما یشرکون۔

ہاں بیشک ایک شبہ اس پر وارد ہوتا ہے کہ اس تمام کارخانۂ قدرت سے جو ہم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں یہ خیال مٹ نہیں سکتا کہ کیا عجب ہے کہ مثل اس کارخانۂ قدرت کے کوئی اور کارخانۂ قدرت ہو جس کو اس سے کچھ تعلق نہ ہو اور اس کارخانۂ قدرت کا ایسا ہی کوئی اور صانع اور علۃ العلل اور موجود بالذات ازلی و ابدی ہو جیسا کہ اس کارخانۂ قدرت کا ہے تو پھر توحید خدا کی کس طرح پر ثابت ہوگی۔

ہم اس شبہ کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بلا شبہ یہ ایک خیالی شبہ ہے جو رفع نہیں ہو سکتا مگر اسلام اور ایمان کی بنیاد خیال پر نہیں ہے

فلسفیہ اور عقلیہ مباحث کو جو حالت فرضیہ غیر وجود سے ہوتی ہیں یقین سے اور ایمان سے کچھ مناسبت نہیں ہے۔ مولانا روم نے اُس کے حق میں نہایت خوب فرمایا ہے ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

یقین کے لئے ضرور ہے کہ معترض اوّل اس بات کا یقین دلائے کہ درحقیقت ایسا ہی دوسرا کارخانہ قدرت موجود ہے اور اُس وقت کہے کہ خدا کی توحید ثابت نہیں مگر وہمی و فرضی باتوں سے خدا کے متعدد ہونے کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔ مذہب اسلام کی رُو سے انسان کو صرف اسی بات کا یقین کہ تمام چیزوں کا جن کو ہم دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں اور جو وجود پذیر ہیں اُن سب کا خدا ایک ہی ہے کافی اور وافی ہے اور اسی قدر پہ انسان مکلّف ہے۔ آمنا بہٖ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

عقیدۂ سوم

متعلق بہ صفاتِ باری جلّ جلالہ

وہ ہستی جس کو ہم خدا یا علّۃ العلل کہتے ہیں نہ ہمارے دیکھنے میں آتا ہے نہ چھونے میں اور نہ خیال میں۔ تو ہم بجز اتنی بات جاننے کے کہ ہے اور کچھ حقیقت اُس کی ذات کی نہیں جان سکتے۔ خدا بھی تو

اپنی ذات کی حقیقت ہم کو نہیں بتا سکا۔ موسیٰ نے پوچھا کہ فرعون کے پاس تیرا پیغام لیکر جاؤں تو کیا بتاؤں کہ تو کون ہے تو یہی جواب ملا کہ "میں وہی ہوں جو ہوں" پس جبکہ ہم ایک ذات کی حقیقت نہیں جان سکتے تو اُس کی صفات کی حقیقت بھی نہیں جان سکتے بلکہ درحقیقت اُس کو کسی صفت کا محل نہیں قرار دےسکتے۔

تمام صفات جن کو ہم خیال کرسکتے ہیں وہ سب مفہومات ہیں جو ہم نے بلحاظ اُن چیزوں کی حالتوں کے جن کو ہم دیکھتے ہیں یا چھوتے ہیں یا سونگھتے ہیں یا سنتے ہیں یا چکھتے ہیں اخذ کئے ہیں مگر جبکہ وہ ہستی ہماری ان سب حقیقتوں سے اوپر ہے تو ہم کیونکر جان سکتے ہیں کہ وہ صفات اُس میں بھی ہیں یا وہ اُن صفات کا محل بھی ہو سکتی ہے اس لئے تمام صفات جو خدا کی طرف نسبت کی جاتی ہیں اُن کو یوں کہا جاتا ہے کہ وہ صفات تو اُس میں ہیں مگر ویسی نہیں ہیں۔ جیسی کہ ہم جانتے ہیں یعنی جو حقیقت اُن صفات کی ہم نے موجودات عالم سے اخذ کر کر سمجھی ہے وہ حقیقت اُن صفات کی نہیں ہے جو اُس میں ہیں اور یہ کہنا ہمارا صاف صاف یہی کہنا ہے کہ اُن صفات کا جن کو ہم جانتے ہیں اُس میں ہونا نہیں جانتے۔

خدا کو ہات پاؤں والا۔ منہ والا۔ بولتا۔ چلتا۔ پھرتا۔ سنتا دیکھتا کرتا۔ کہاتا۔ جیتا۔ جاگتا۔ خوش ہونے والا۔ خفا ہونے والا سب کچھ کہتے ہیں۔ مگر اُس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے سے ہاتھ پاؤں ہمارا سا منہ

ہمارا سا بولنا۔ ہمارا سا چلنا پھرنا۔ ہمارا سا سننا دیکھنا۔ ہمارا سا کرنا کرانا۔ ہمارا سا جینا جاگنا۔ ہمارا سا خوش اور خفا ہونا نہیں ہے۔ مگر جب پوچھو کہ اگر ویسا نہیں ہے تو پھر کیسا ہے تو جواب یہی ہو گا کہ ہم نہیں جانتے۔ بات کا تو بہت الٹ پھیر ہوا مگر نتیجہ یہی نکلا کہ اُن صفات کا جن کو ہم جانتے ہیں اُس میں ہونا نہیں جانتے۔

صفات باری کا اُس کی نسبت یقین کرنا اس یقین سے نہیں ہے کہ درحقیقت وہ صفتیں جس طرح پر ہم اُن کو جانتے ہیں اُس میں ہیں یا وہ اُن کا محل ہے بلکہ وہ یقین اس وجہ سے ہے کہ ایسی ذات کو جو علۃ العلل ہے اِن صفات کے مشابہ صفتوں کا موصوف یا اِن صفات کی مانند قدرتوں پر قادر ہونا لازم ہے کیونکہ بغیر اُن کے وہ علّۃ علۃ العلل نہیں ہو سکتی جس کا علّۃ العلل ہونا تسلیم کیا تھا۔

زندگی اور موت وہ صفتیں ہیں جن کے مفہوم کو ہم نے جاندار چیزوں کے حالات سے اخذ کیا ہے پس کیا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ وہ اُس زندگی یا موت کا جس کو ہم جانتے ہیں خدا محل ہو سکتا ہے یا ایں ہمہ اُس کو حَیٌّ لَا یَمُوتُ کہتے ہیں۔ دہریوں نے مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں اُن لفظوں کو جو صفات باری کی نسبت بولے گئے ہیں اُنھی مفہومات کا دال سمجھ لیا جو اُنہوں نے موجودات کے حالات سے اخذ کئے تھے اور پھر اُن صفات کے منکر ہو کر کہنے لگے کہ ہم کیونکر یقین کریں کہ صفت قدرت کی یا رحم کی اُس میں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم کب

یقین کرتے ہیں اور ہم کب اُن صفتوں کا جن کو ہم جانتے ہیں اُس کو محل قرار دیتے ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جن صفتوں کو ہم جانتے ہیں ویسی ہی کچھ اُس علۃ العلل کی ذات کو لازم ہیں اور اسی لئے اُس کے لوازم ذاتی ہونے پر یقین ہے اور جو کہ ذات اور لوازمِ ذات عینِ ذات ہوتے ہیں اس لئے ہم اُس کی صفات کو عینِ ذات اور اُس کی ذات کو عینِ صفات قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر یہ ترانہ گاتے ہیں کہ "انا صفۃ من صفات اللہ وصفاتہ عینہ فانا عینہ" اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ "لیس فی جبّتی سوی اللہ" اور جب اور زیادہ بھول کر کہنا چاہتے ہیں تو یوں کہتے ہیں کہ "انا احمد بلا میم"۔

عشق گر مرد است مردے بر سرِ کار آورد | ورنہ چوں موسیٰ بسے آوردہ و بسیار آورد
گر ہمے خواہد کہ وصفِ ذاتِ خود ثابت کند | یک انا الحق گوئے دیگر بر سرِ دار آورد
یوسفؑ یعقوبؑ را بر دل پریشانش چہ سود | مردِ عشقے ہمچو احمدؐ را بہ بازار آورد

غرض کہ ہم تمام صفات کو بطور ایجاب یا بطور سلب ذات باری کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اُس میں اُن صفات کے ہونے اور نہ ہونے کا بھی یقین کرتے ہیں مگر نہ اس وجہ سے کہ وہ اُن کا محل ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ہم کو اُن مفہومات کے من حیث الاطلاق لوازم ذاتی علۃ العلل کے ہونے پر یقین کلی ہے۔ با ایں ہمہ جس طرح ہم اُس کی ذات کی حقیقت کو نہیں جانتے اسی طرح اُس کی صفات کی حقیقت کو بھی نہیں جانتے۔

بانئے اسلام نے بھی اُن کی حقیقت کا جاننا ہمارے ایمان کا

جزو نہیں قرار دیا بلکہ خود اُس نے اُن کی حقیقت کو کچھ نہیں بتلایا غفور۔ رحیم۔ قادر۔ حی۔ لایموت بتایا اور اِس بتانے سے اُس کی ذات کا اُن کا محل ہونا لازم نہ آیا تو ایسا خیال کرنا خود ہماری غلطی ہے

خدا کے ساتھ جن صفتوں کو ہم بتاتے ہیں گو اُن کے مفہومات تو موجودات کے حالات سے اخذ کئے ہوئے ہیں مگر خدا کی طرف من حیث الاطلاق نسبت کرتے ہیں بلکہ اطلاق کی قید سے بھی مطلق رکھتے ہیں تاکہ صرف مفہوم ہی مفہوم باقی رہ جاوے اور ایسی لئے جب کسی صفت کو کہتے ہیں کہ ہے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسی نہیں ہے۔

یہ ایک بحث عام صفات باری کی نسبت تھی اور آیندہ ہم وقتہً فوقتہً ہر ایک صفت کی نسبت خاص خاص بحث کرینگے۔ واللہ ولی التوفیق

(سر سید)

تہذیب وشائستگی

اصل شائستگی خیال کی شائستگی ہے

ہمارے اس زمانہ میں شائستگی اور تہذیب پر بہت بحث ہو رہی ہے اور مسلمانوں میں اُس کی نسبت ایک گرم مباحثہ قایم ہے اور لوگوں کی مختلف رائیں ہو رہی ہیں کوئی طرز لباس کو شائستگی پر بہت کچھ مؤثر سمجھتا ہے اور کوئی کھانا کھانے کے طریقوں کی تبدیلی کرنا چاہتا ہے

کسی کو ایک بات مہذب اور شایستہ معلوم ہوتی ہے دوسرا اُسی کو نامہذب اور ناشایستہ ٹھہراتا ہے۔ کوئی اپنی گھیتلی جوتی اور جبہ و دستار میں خوش ہے کہ شایستگی را ہمچنیں شاید۔ کوئی انگریزی بوٹ چڑھائے اپنے کوٹ و پتلون پر غش ہے کہ تہذیب ہمیں یک معنی دارد۔۔ مگر میری دانست میں یہ سب قصے اور بکھیڑے ہیں اور اصل شایستگی خیال کی شایستگی ہے۔

تہذیب و شایستگی کا عمدہ اور اعلےٰ منشا یہ ہے کہ انسان اس طرح پر اپنی زندگی بسر کرے جس سے اپنی ذات بھی ہمیشہ آرام اور خوشی اور تندرستی کے ساتھ رہے اور دوسروں کو بھی اُس سے فائدہ پہنچے اور ایسے وسیلے بہم پہنچائے جاویں جن سے ہر قسم کی مشکلات پر غالب آنا سہل اور ہر قسم کی خوشی اور راحت حاصل ہونا آسان ہو جاوے۔ پس جس انسان کے دماغ میں ایسی قوت ہو کہ وہ ان تمام باتوں پر قادر ہو سکے اُسی کو ہم شایستہ کہہ سکتے ہیں اور اسی کا نام خیال کی شایستگی ہے باقی وہ امور جو طرز معاشرت اور طریق تمدن سے علاقہ رکھتے ہیں وہ انسان کی بسر زندگانی کے ایسے خارجی اسباب ہیں جن پر ایک شایستہ اور مہذب آدمی ملک کے مختلف موسموں اور آب ہوا وغیرہ کے لحاظ سے اسباب پر غور کر سکتا ہے کہ ان امور میں سے کس امر سے مجھکو آرام ملیگا اور کس سے میں بخوبی تندرست رہ سکتا ہوں اور کونسی چیز میری خوشی کو بڑھا سکتی ہے اور میرا کونسا کام دوسروں

سکے لئے مفید ہو سکتا ہے اور یہ جو اسکے قایم ہو اُس پر ہر عاقل انسان کو
عمل کرنیکا حق ہے لیکن خیال کی شایستگی اور درستی سے پہلے اُن
امور میں سے کسی کو تقلیداً اختیار کرنا اور کسی کو ترک کرنا انسان کو
شایستہ نہیں بنا سکتا۔

جس آدمی کا خیال شایستہ ہے اُسکے تمام کام خودبخود ایسی عمدہ ترتیب
سے انجام پاتے ہیں جس سے وہ تمام خوشیاں اور آرام جو تہذیب و
شایستگی کا نتیجہ ہیں بالضرور حاصل ہوں۔ نامہذب آدمی کے تمام کام
ہمیشہ بے ترتیب ہوتے ہیں جن سے زندگی اور تلخ ہو۔ مہذب آدمی
کی مثال بالکل انسان کی تندرستی کی سی ہے۔ جب تک انسان
تندرست ہوتا ہے اُسکے تمام اعضا اپنے موقع سے وہ تمام کام
خودبخود کرتے رہتے ہیں جو انسان کی راحت اور خوشی بڑھانے کا ذریعہ
ہوں اور رنجوں اور تکلیفوں کو دور کریں۔ جن آدمیوں کا خیال
شائستہ نہیں ہوا ہے اور وہ کسی شائستہ اور مہذب قوم کی چند
رسموں اور دستوروں کی تقلید ہی کو شایستگی سمجھتے ہیں اُن کی
مثال بالکل ایک ایسے مریض کی سی ہے جو تندرستوں کی سی حرکتیں
کرنا چاہتا ہو۔ مگر کسی طرح اُس مریض کی یہ حرکتیں ایک تندرست آدمی
کی کاموں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے ابھی خیال
شایستہ نہیں ہوئے اُنکے بعض تقلیدی طریقے اُن کو مہذب اور شایستہ
نہیں کر سکتے۔

پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ سب سے پہلے اپنے خیالات کو عمدہ کریں
اور اگر اُن کے خیال عمدہ ہو گئے تو سب قسم کی ترقیاں خود بخود اُن میں
ہو جاویں گی ورنہ تقلیدی شائستگی سے کچھ کام نہیں چل سکتا کبھی
ایسی ٹہنی سے پھولوں کے کھلنے کی توقع نہیں ہو سکتی جس کا سلسلہ
ایک مستحکم جڑ تک نہیں پہنچتا گو دیکھنے والوں کی نظروں میں وہ کیسی ہی
سرسبز اور شاداب معلوم ہوتی ہو۔

اور خیالات اُس وقت تک عمدہ نہیں ہو سکتے جبتک دوسروں کے
خیال سے معاوضہ نہ کیا جاوے۔ جس طرح مال و دولت پھیر بدل سے
بڑھتا ہے اسی طرح خیال کی بھی ترقی ہوتی ہے جب آدمی تعصب کو
چھوڑ کر دوسروں کی رائے اور دوسروں کے خیال پر غور کرتا ہے اور
اپنے خیالات سے دوسروں کو مطلع کرتا ہے اور پھر دونوں رایوں اور
دونوں خیالوں کا باہم مقابلہ ہوتا ہے اور ایک خیال صحیح اور دوسرا
خیال غلط یا ایک کامل اور دوسرا لائق اصلاح معلوم ہونے لگتا ہے
تب رفتہ رفتہ انسان کا خیال ترقی کرنے لگتا ہے اور جب یہ ترقی کامل
ہو جاتی ہے تو انسان مہذب اور شائستہ کہلانیکا مستحق ہوتا ہے۔

انسان کے خیال کی ترقی بالکل اس طرح سے ہوتی ہے جس طرح
کوئی شخص درجہ بدرجہ سیڑھیوں پر چڑھتا ہے اور کسی بلند زینہ کو طے
کرتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ زینہ کو طے کرتے وقت انسان خود بھی
دیکھتا ہے کہ کس قدر دوری میں طے کر چکا ہوں اور کس قدر دوری ابھی

باقی ہے خیال کی ترقی میں انسان کو خود اچھی طرح معلوم نہیں ہوتا کہ میں نے کس قدر ترقی کی لیکن اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔

انسان ایک وقت میں ایک عمدہ اور نہایت عمدہ کام کو اس قدر بُرا جانتا ہے اور اپنے نزدیک اُسکی بُرائی کا ایسا قطعی فیصلہ کرلیتا ہے کہ اُس رائے کے برخلاف تذکرہ کرنا بھی فضول سمجھتا ہے خیال کی یہ حالت اُس وقت ہوتی ہے جب تک وہ ترقی کے زینہ پر قدم نہیں رکھتا مگر جب ایسی گفتگوئیں اُس کے سامنے برابر جاری رہتی ہیں تو یہ شخص اُن کو سُن سُن کر پیچ و تاب کھاتا ہے اور اپنی مخالف رایوں کو رد کرنے لگتا ہے بہت سے دلائل اپنے خیال کی تائید میں پیدا کرتا ہے۔ اور بڑی جد و جہد سے اپنی مخالف رایوں کے جواب دینے کی فکر میں پڑ جاتا ہے۔ یہ حالت خیال کی ترقی کی پہلی سیڑھی ہے۔

جب کوئی آدمی اس سیڑھی پر چڑھ گیا ہے تو اب وہ ایک ایسے مباحثہ میں پڑا جہاں بالضرورت موافق اور مخالف رائیں اُس کو دیکھنی پڑتی ہیں کچھ عرصہ تک وہ پہلی ہی سیڑھی پر قدم مضبوط گاڑے ہوئے کھڑا رہتا ہے مگر آخر کار اُس کا خیال اس بات پر غور کرنے لگتا ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کون سی صحیح ہے اور کون سی غلط۔ یہ حالت خیال کی ترقی کی دوسری سیڑی ہے۔

سچائی کا یہ ذاتی وصف ہے کہ اگر انسان اُس پر بغیر کسی تعصب کے غور کرتا رہے تو بیشک اُس کو سچائی کا اقرار کرنا پڑتا ہے اور میں یہ

کہتا ہوں کہ اگر سخت سے سخت تعصب کے ساتھ بھی کسی بات پر برابر
غور اور مباحثہ جاری رہے تو بھی ایک نہ ایک دن سچائی غالب ہو رہیگی
مگر بہت دیر کے بعد۔ پس جن رایوں پر انسان دوسری سیڑھی پر کھڑا
ہوا غور کرتا ہے اگر اُن میں سے وہ رائے جس کو وہ پہلے بُرا جانتا تھا
درحقیقت سچ ہوتی ہے تو بلا شبہ انسان اُس کو اپنی استعداد کے موافق
خواہ جلد خواہ بدیر قبول کر لیتا ہے اور یہاں وہ انما یستجیب الذین
یسمعون کا مصداق بنتا ہے یعنی بات کو قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے
ہیں۔ یہ حالت خیال کی ترقی کی تیسری سیڑھی ہے۔

اُس سیڑھی پر پہنچکر آدمی اُس رائے کو جسکے برخلاف ایک دن
گفتگو تک کرنا فضول خیال کرتا تھا۔ غلط سمجھنے لگتا ہے اور کچھ مدت تک
وہ اسی تیسری سیڑھی پر کھڑا رہتا ہے وہ اوروں کو چوتھی سیڑھی پر
چڑھتے ہوئے دیکھتا ہے مگر خود ارادہ نہیں کرتا وہ اپنے ساتھیوں کو
ایک کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے جس کو وہ صحیح تسلیم کر چکا ہے مگر اس پر
عمل کرنے کو وہ اچھا نہیں جانتا۔ وہ اہل کتاب کے ساتھ مواکلت تک
کو اب بُرا نہیں جانتا اُس کو مستحق عذاب الٰہی نہیں سمجھتا اور آخر کار
اُسکی منفعتوں کا بھی اقرار کرنے لگتا ہے مگر نہ آپ اُسکے کرنے کی
جرأت رکھتا ہے نہ دوسروں کے اس عمل کو پسند کرتا ہے مگر کچھ
دنوں کے بعد وہ چوتھی سیڑھی پر چڑھتا ہے یہاں بھی اُس کام کو
اختیار نہیں کرتا جس کو خود اچھا جان چکا ہے مگر اتنا فرق ہو جاتا ہے

کہ یہاں پہنچکر وہ دوسروں کو بھی اُس کام کی وجہ سے بُرا نہیں سمجھتا اُن کو ملامت کرنا چھوڑ دیتا ہے جو حقارت اور نفرت اُسکے دل میں اُس کام کے اختیار کرنے کے سبب سے اَوروں کی طرف سے ہوتی ہے وہ اب باقی نہیں رہتی - ہمارے بعض دوستوں کا قول ہے کہ جن لوگوں کے خیال کی ترقی اس چوتھے درجہ تک ہوجاتی ہے وہ تہذیب وشائستگی کی یونیورسٹی یا دار العلوم میں داخلہ کا امتحان پاس کرتے ہیں -

اسکے بعد جب آدمی دوسروں کو وہ کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے جس کا مفید ہونا اُس کو تسلیم ہے اور اُنکا وہ فعل اُس کو ناگوار بھی نہیں معلوم ہوتا تو تھوڑی دیر دم لیکر اب وہ پانچویں سیڑھی پر آتا ہے یہاں وہ اس تردد میں پڑتا ہے کہ میں بھی اس کام کو کروں یا نہ کروں دوسروں کو مفید مفید کام کرتے ہوئے دیکھکر جی بہت للچاتا ہے مگر جرأت نہیں پڑتی - عقل بالکل آگے چلنے کی رغبت دلاتی ہے مگر مصلحت[۷۵] دامن نہیں چھوڑتی - اس پانچویں سیڑھی پر بڑی بے چینی سے گذرتی ہے صبح کو ارادہ ہوتا ہے کہ آج تو مسلمان ہو ہی جائیے مگر شام پھر ویسی ہی تاریک آتی ہے جیسی گذری ہوئی شام تھی شام کو یہ قصہ ہوتا ہے کہ کل ہر چہ بادا باد - مگر صبح کو آفتاب کا قہرناک چہرہ پھر ویسی ہی ہیبت طاری کر دیتا ہے -

۷۵ یہ ایک ہنسی ہے اُن لوگوں کی جو کسی کام کی خوبی کو عقلاً تسلیم کرتے ہیں مگر مصلحت کا عذر کرتے ہیں - حالانکہ عقل اور مصلحت بالکل ایک ہے

لیکن آخر کار ہمت مرداں مدد خدا ایک دن یہ مشکل مقام بھی طے ہو جاتا ہے اور خدا کا نام لیکر آدمی اُن کاموں کو خود کرنے لگتا ہے جن کو وہ ایک دن نادانی اور ناسمجھی سے برا سمجھتا تھا اور اب بہت سے مباحثوں اور گفتگوؤں اور غور و تامل کے بعد اُن کو نہ صرف بُرائی سے بری خیال کرتا ہے بلکہ اُنکے مفید اور نہایت مفید ہونے پر کامل یقین کر لیتا ہے۔ یہ حالت انسان کے خیال کی چھٹی سیڑھی ہے۔

اس سیڑھی پر قدم رکھتے ہی آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ زینہ ختم ہو گیا اور اب وہ ایک ایسے بلند اور خوش فضا سطح پر پہنچ جاتا ہے جس کی خوبیاں بیان سے باہر ہیں اور ہر ایک سیڑھی پر جتنی جتنی دیر ٹھہرنیکا اتفاق ہوا تھا اُس پر افسوس کرتا ہے۔ اب وہ دیکھتا ہے کہ اُس نہایت ہی دلکش میدان میں جا بجا صاف اور شیریں چشمے اور نہریں جاری ہیں سبزہ نے تمام میدان پر فرش زمردین بچھا دیا ہے مختلف قسم کے پھول اور پودے اور درخت جدا لطف دکھلا رہے ہیں۔ مرغان خوش الحان اپنی اپنی بولیوں میں اپنے پروردگار کی یاد میں مصروف ہیں وہاں اگر کوئی ناہموار مقام بھی ہے تو نہایت ہی دلچسپ دکھلائی دیتا ہے اور وسط میں ایک چشمہ کے کنارہ پر نہایت خوبصورت ایک مینار ہے اور اُسپر موٹے موٹے طلائی حرفوں میں عربی خط سے یہ عبارت لکھی ہوئی ہے

دنیا میں خدا کی یہ رحمت خاص اُن مسلمانوں کے واسطے ہے جو چھٹوں سیڑھیاں طے کرکے یہاں تک پہنچ جاویں۔

میں نے ایک مقابل کے اونچے ٹیلے پر چڑھکر اس تمام کیفیت کو دیکھا
میں نے دیکھا کہ اُس گلستان ہمیشہ بہار میں جابجا نہایت ہی قرینہ کے
ساتھ بہت ہی پر تکلف بہت سے تخت اور آرام چوکیاں بچھی ہوئی ہیں
بہت سے لوگ مجھ کو اُن تختوں اور آرام چوکیوں پہ بیٹھے ہوئے معلوم
ہوئے لیکن نہ میں اُن لوگوں کی صورت پہچان سکا نہ اُن کی بولی
کچھ میری سمجھ میں آئی۔ عقل سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ مصر اور
قسطنطنیہ اور ٹونس وغیرہ کی طرف کے مسلمان ہیں جوان چھیوں سیڑھیوں
کو طے کر چکے ہیں اور اب خدا کی رحمت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

میں اُن بہت سے شخصوں میں سے صرف دو شخصوں کو پہچان سکا
جن کے تخت میدان کے کنارہ پر اُس مقام پر بچھے ہوئے تھے جہاں
وہ زینہ ختم ہوتا ہے ایک تخت پر میں نے سید احمد خاں کو دیکھا کہ تہذیب الاخلاق
کی بہت سی نفیس نفیس اور سنہری جلدیں اُنکے سامنے رکھی ہوئی ہیں
اُنمیں سے وہ کسی جلد کو اُٹھا کر کوئی کوئی مضمون ہندوستان
کے مسلمانوں کو سنا رہے ہیں اور جس عمدہ مقام پر وہ خود موجود ہیں
اور جس کی خوبیاں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اُس کو بڑی
دلسوزی اور محبت کے ساتھ اُن لوگوں کو سمجھاتے ہیں جو اُس زینہ
کے نیچے گروہ در گروہ نہایت بے ترتیبی اور بے سروسامانی کی حالت
میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور زبان حال سے یہ کہتے جاتے ہیں۔
یا لیت قومی یعلمون۔

میں نے اُس ٹیلہ پر سے دیکھا کہ کوئی مسلمان جسکے کان میں سید احمد خاں کی آواز پہنچی ایسا باقی نہ رہا تھا جس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی ہو۔ میں نے دیکھا کہ تمام مسلمان پہلی آواز پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُس خیال کی ترقی کے زینہ کی طرف کو دوڑے اور جیسی جس کی استعداد اور قوت تھی ویسی ہی اُس نے ترقی کی بعض ضعیف الجثہ اور کم ہمت یا نابینا اور لولے لنگڑے ابھی پہلی سیڑھی تک بھی نہیں پہنچے ہیں باقیوں میں کوئی پہلی سیڑھی پر ہے کوئی دوسری سیڑھی پر کسی نے تیسری سیڑھی تک ترقی کر لی ہے اور کوئی چوتھی سیڑھی پر پہنچ گیا ہے اور بعض جو بہت ہی عقلمند اور ذکی اور چست و چالاک تھے وہ پانچویں سیڑھی تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ جو لوگ پانچویں سیڑھی پر پہنچ گئے ہیں اُن کو سید احمد خاں ہاتھ بڑھا کر اپنے برابر اوپر لے لیتے ہیں چنانچہ میرے دیکھتے دیکھتے اُنہوں نے پانچویں سیڑھی پر سے ایک شخص کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کو کھینچ لیا وہ بھی اُس پر فضا سیدان کی راحتوں اور خوشیوں کا لطف حاصل کرنے لگا اور سید احمد خاں کی برابر اپنی آرام چوکی سے ہاتھ لگا کر کھڑا ہو گیا میں نے جب غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ آہا یہ مولوی سید مہدی علی صاحب ہیں جو اپنی چستی اور رسائی عقل سے بہت جلد چھیوں سیڑھیاں طے کر گئے اُن کو میں اس عمدہ مقام میں پہنچا ہوا دیکھکر بہت ہی خوش ہوا۔ مولوی سید مہدی علی صاحب نے بھی ایک جلد سید احمد خاں کے سامنے سے اٹھائی اور اُنہوں نے

بھی اُسکے مضامین بآواز بلند اُن لوگوں کو سُنانے شروع کئے جو یازینہ طے کررہے تھے یا زینہ کے نیچے اُس پر چڑھنے کی فکر میں کھڑے ہوئے تھے
میں نے ایک اور مولوی صاحب کو بھی دیکھا جو چوتھی سیڑھی سے پانچویں سیڑھی پر چڑھنے کی تیاری کررہے تھے اور عنقریب پانچویں سیڑھی پر پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر اُنھوں نے مجھے دور سے اشارہ سے منع کیا کہ میرا نام ابھی کسی سے نہ لینا اُنھوں نے بھی سید احمد خاں کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کردی اور جو بات وہ سید احمد خاں سے قریب ہونے کی وجہ سے اچھی طرح سنتے اور سمجھتے تھے اُس کو نیچی سیڑھیوں والوں کو سمجھانے لگے۔

پہلی اور دوسری سیڑھیوں والوں کی کیفیت دیکھکر مجھکو بے اختیار ہنسی آئی میں نے دیکھا کہ وہ سید احمد خاں کی آواز سنتے ہی دوڑے اور کوئی پہلی اور کوئی دوسری سیڑھی اُس زینہ کی طے کرگیا گویا سید احمد خاں کے منشار کی پوری تعمیل میں مصروف ہیں لیکن باایںہمہ وہ سید احمد خاں سے مخاطب ہوکر زبان درازیاں کرتے جاتے ہیں اُن میں سے کوئی کہتا ہے کہ سید احمد خاں کی ایک مت سنو کوئی کہتا ہے کہ بالکل اُس کے برخلاف کام کرو یہ کہتے جاتے ہیں اور اوپر کو چڑھتے جاتے ہیں۔
سید احمد خاں بھی اُن کی اس حالت کو دیکھکر مسکرا پڑے اور کہنے لگے کہ کیسے پاگل آدمی ہیں جس کام کو کرتے جاتے ہیں اُسی کو بُرا کہتے ہیں جس راستہ کو منع کرتے ہیں اُسی طرف کو چلتے جاتے ہیں مگر

تا ہم کے تین سیڑھیاں اُن کو بھی طے کرنا باقی ہیں سمجھدار ہوتے جلد طے کر لیتے نادان ہیں بدیر طے کریں گے۔

یہ مزے مزے کی باتیں دیکھکر میں اُس ٹیلہ پر سے اُتر آیا اور اُس وقت سمجھا کہ سید احمد خاں کے تہذیب الاخلاق نے ہندوستان کے مسلمانوں میں کیا اثر پیدا کیا ہے اور آیندہ کیا اثر پیدا کرے گا۔

(نواب مشتاق حسین)

نبی کی ضرورت پر ایک وجدانی شہادت

جو باتیں انسان کو مذہب نے تعلیم کی ہیں اور جن کو وہ الہامی جانتا ہے وہ عموماً یا تو خدا تعالیٰ کی ذات و صفات سے علاقہ رکھتی ہیں یا اُس جزا و سزا سے جس کا وقت موت کے بعد مقرر کیا گیا ہے اور اس لئے ہم تمام مذہبی تعلیمات کو علم مبدا و معاد کہتے ہیں پس نبی کی ضرورت ثابت کرنے کے لئے ہم کو دو باتوں کا ثبوت دینا کافی ہے۔ ایک یہ کہ مبدا و معاد نفس الامر میں ایسی دو حقیقتیں ہیں جن کا علم حاصل کرنا انسان پر واجب ہے۔ دوسرے یہ کہ مبدا و معاد کا علم نبی کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

جس طرح مثلاً عمل کیمیا کے ذریعہ سے ہم اس بات کا مشاہدہ کرا سکتے ہیں کہ پانی بسیط نہیں ہے بلکہ دو مختلف گاسوں یعنی اوکسیجن اور ہائیڈروجن سے مرکب ہے اس طرح ہم یہ ہرگز نہیں دکھا سکتے کہ یہ مبدا ہے اور

یہ معاد - لیکن ہم ان دونوں چیزوں کے وجود پر انسان کی اصل فطرت کو گواہ کر سکتے ہیں اور اُس کی گواہی ہمارے نزدیک مشاہدہ سے بھی زیادہ یقینی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انسان کا حال جو تفحص کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو ادنےٰ تامل کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اُس کو اکثر چیزوں کا علم اکتساب سے حاصل ہوتا ہے اور اُس کو کسبی علم کہتے ہیں اسی طرح بعضی باتوں کا علم اُس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے جس کو فطرتی یا وہبی یا قدرتی علم کہہ سکتے ہیں مثلاً ضرورت کے وقت کھانا پینا۔

دھوپ اور مینھ میں سایہ ڈھونڈنا جاڑے میں گرم ہونیکی تدبیریں کرنی یہ باتیں اُس کو قدرت کے سوا کسی نے نہیں سکھائیں کیونکہ ہم یہی باتیں اُسکے ابنائے جنس یعنی اور حیوانات میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں جن کا معلم اور اُستاد قطعاً قدرت کے سوا اور کسی کو نہیں ٹھہرا سکتے اور جب ہم گھونسلا بنانے میں بئے کی کاریگری اور شہد حاصل کرنے میں مکھی کی حکمت اور جالا پورنے میں مکڑی کا ہنر دیکھتے ہیں اور اکتساب کی راہیں چاروں طرف سے مسدود پاتے ہیں تو ہمکو اس بات میں بالکل شک نہیں رہتا کہ قدرتی علم صرف میلِ طبعی ہی کا نام نہیں ہے بلکہ بعضے ایسے دقایق اور صنایع بھی اس میں داخل ہیں جو بادی النظر میں قوت متفکرہ کے نتایج معلوم ہوتے ہیں۔

پھر جب ذرا اور تامل کیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قدرتی علم کے لحاظ سے انسان اور اُس کے ابنائے جنس کیں دو طرح کا امتیاز رکھا گیا ہے ایک یہ کہ اَور حیوانات کا قدرتی علم ہمیشہ ایک خاص حد پر محدود رہتا ہے کبھی اُس سے تجاوز نہیں کرتا مثلاً جو گھونسلا ابابیل نے نوح علیہ السلام کی کشتی میں بنایا ہوگا اُس میں اور اِس زمانہ کے گھونسلوں میں ہرگز کچھ تفاوت نہ ہوگا۔ بخلاف انسان کے کہ اُس کا قدرتی علم ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہتا مثلاً اگر پانچ چار ہزار برس پہلے کی بعض انسانی عمارتیں اس زمانہ کی عمارتوں سے ملائی جائیں تو شاید اِس بات کا یقین بہت مشکل سے آئے کہ دونوں کام ایک ہی نوع کے افراد نے بنائے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اَور حیوانات کو صرف وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جو اُنکے مصالح جزئیہ اور اغراض محسوسہ کے لئے مفید ہوں اور بُری بھلی طرح اُن کی حاجت رفع کردیں جیسے بھوک کے وقت دانہ یا گھاس یا گوشت وغیرہ کھالینا پیاس کے وقت پانی پینا دھوپ اور مینھ یا سردی کے بچاؤ کے لئے گھونسلا یا بل یا بھٹ وغیرہ بنانا اپنے بچوں کی ایک خاص مدت تک پرورش کرنی بخلاف انسان کے کہ اُس کے سینہ میں ماں باپوں کے سوا وہ علوم بھی القا کئے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اپنے مصالح کلیہ اور منافع آیندہ کا سراغ لگا سکتا ہے جیسے جھوٹ بولنا یا خیانت کو بُرا جاننا اور سچ یا عدالت یا امانت کو اچھا جاننا۔

پھر جب ذرا اور تامل کیا جاتا ہے تو انسان کے قدرتی اور اکتسابی
علم میں تین طرح کا امتیاز ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے ایک یہ کہ قدرتی
علم کی اصل تمام نوع میں متحقق ہونی ضرور ہے کیونکہ ہم اس علم کے آثار
اور حیوانات میں اسی طرح مشاہدہ کرتے ہیں مثلاً شہد کی مکھی جس طریقہ سے
شہد حاصل کرتی ہے اور مکڑی جس ہنر سے جالا پورتی ہے وہ طریقہ اور
وہ ہنر اُن کے تمام بنی نوع میں پایا جاتا ہے مگر چونکہ انسان کو خدا تعالیٰ
نے عقل عنایت کی ہے اور عقل کا مقتضی تمام افراد میں یکساں نہیں ہوتا
اس لئے وہ قدرتی اصل ایک صورت پر قایم نہیں رہتی مثلاً عورت
اور مرد کو بغیر کسی تخصیص کے ایک دوسرے پر حرام جاننا ایک عام قانون
ہے جو کہ انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے مگر اُس تخصیص کی صورتیں
ہر قوم میں جُدا جُدا ہیں مسلمانوں کے ہاں اور طریقہ ہے ہندوؤں
کے ہاں اَور دستور ہے عیسائیوں کے ہاں اور قاعدہ ہے بخلاف
اکتسابی علم کے کہ وہ نوع کے بعض افراد میں متحقق ہوتا ہے بعض میں
نہیں ہوتا جیسے علم جیولوجی اور علم برق کہ یہ دونوں علم اہل یورپ کے
ساتھ مختص ہیں یا ایک زمانہ میں مختص تھے یا جیسے حرکات کواکب کا علم
یا علم ہندسہ کہ ایک زمانہ میں اہل مصر کے ساتھ مختص تھا۔ دوسرے
یہ کہ جب انسان کو کوئی ایسی بات تعلیم کیجائے جو قدرت نے اس کو
پہلے سے سکھا رکھی ہے تو ضرور ہے کہ وہ بات بغیر دلیل اور برہان کے
اُس کے دل میں تہ نشین ہو جائے بخلاف اکتسابی علم کے کہ جبتک

اس پر کافی دلیلیں قائم نہ کی جائیں تب تک اسکی صداقت پر ہرگز دل گواہی نہیں دے سکتا مثلاً اگر ہمارے سامنے کوئی یہ کہے کہ گرمی کی شدت میں سرد ہوا سے نہایت فرحت حاصل ہوتی ہے تو خواہ وہ اس کا طبعی سبب بیان کرے خواہ نہ کرے ہم کو اسکے تسلیم کرنے میں کچھ تردد نہیں ہوتا لیکن اگر وہ ہم سے یہ آکر کہے کہ ہوا دو مختلف گاسوں یعنی انٹروجن اور اوکسیجن سے مرکب ہے تو ہم اس بات کے خواہاں ہونگے کہ وہ عمل کیمیا کے ذریعہ سے ہوا کے اجزا تحلیل کرکے ہمکو دکھا دے تیسرے جو علم انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے اس میں کبھی خطا واقع نہیں ہوتی لیکن مرض کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے پیاس کا بجھانا جو انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے اس میں کبھی خطا واقع نہیں ہوتی لیکن مرض کی حالت میں جب پیاس اس قدر بڑھ جائے کہ صرف ٹھنڈے پانی سے فرو نہ ہو سکے اور اس کا علاج کسی ٹھنڈی دوا سے کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ بالکل فائدہ نہ بخشے یا پیاس کو اور زیادہ کردے۔

ان سب باتوں میں غور کرنیکے بعد جب ہم اپنے اصل مقصود کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہم کو اس بات کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جہاں قدرت نے انسان کو اور ہزاروں باتیں تعلیم کی ہیں انہیں باتوں میں سے مبدا و معاد کا اجمالی علم بھی ہے یعنی اس قدر جاننا کہ کوئی ہمارا صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو کچھ نہ کچھ اپنی برائی بھلائی کا ثمرہ ملنے والا ہے یہ انسان کی اصل فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے کیونکہ جہاں تک ہماری نگاہ پہنچتی ہے

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آدمی عام اس سے کہ مذہب کا پابند ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ الوہیت کا قایل ہو یا منکر بہرحال جس وقت وہ کسی ایسی خطرناک حالت میں پھنس جاتا ہے جس سے جان بر ہونیکی کوئی تدبیر نظر نہیں آتی اور جن وسایل پر اُس کو بھروسہ تھا وہ سب منقطع ہو جاتے ہیں تو جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھینچتا ہے اسی طرح اُس کی عالی توجہ اور باطنی ہمت چاروں طرف سے سمٹ کر ایک ایسی بن دیکھی اور اَن سمجھی ذات کی طرف کھینچتی ہے جس کو وہ اڑے وقت کا سہارا اور اپنی تمام تدبیروں کا منتہا سمجھتا ہے اسی طرح جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہم نوع انسان کے کسی فرد کو اس بات سے خالی نہیں پاتے کہ وہ بعض بُرائیوں سے نہ کسی دنیوی مضرت کے اندیشہ سے بلکہ ایک ایسے خوف کے سبب سے بچتا ہے یا بچنے کا ارادہ رکھتا ہے جس کا کھٹکا اُس کو مرنے کے بعد ہے اور بعض بھلائیاں نہ کسی دنیوی منفعت کے لئے بلکہ ایک ایسی توقع پر کرتا ہے یا کرنیکا ارادہ رکھتا ہے جس کے پورے ہونے کی اُمید اُس کو مرنے کے بعد ہے اسی مطلب کو ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ ہر فرد انسانی بعضے کاموں کو نہ کسی دنیوی مضرت یا منفعت کے لحاظ سے بلکہ محض دل کی شہادت سے مذموم یا محمود جانتا ہے حالانکہ کسی شے کو بُرا یا بھلا جاننا اُسکے نتائج کے بُرا یا بھلا جاننے پر موقوف ہے پس اس کے سوا کوئی بات ذہن میں نہیں آتی کہ معاد کا اجمالی علم جو اُسکی فطرت میں رکھا گیا ہے صرف اُس کی ہدایت سے وہ اُن کاموں کو بُرا یا بھلا جانتا ہے۔

اس ساری تقریر سے یہ نتیجہ نکلا کہ مبدا و معاد کا اجمالی علم انسان کو قدرت نے تعلیم کیا ہے کیونکہ اگر اکتساب سے حاصل ہوتا تو اُسکے آثار تمام بنی نوع میں بلا استثناء ہرگز نہ پائے جاتے۔ لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ خیالات انسان کی اصل فطرت میں ودیعت نہ کئے گئے ہوں بلکہ مذہبی تعلیمات کے سبب رفتہ رفتہ تمام دنیا میں پھیل گئے ہوں مگر یہ شبہ ہم کو ایک ایسی دلیل کی طرف ہدایت کرتا ہے جس سے ہمارے مطلب کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم کا ایک یہ بھی خاصہ ہے کہ جب کوئی بات اس کے موافق انسان کو تعلیم کی جاتی ہے تو وہ اُس کو بغیر دلیل اور برہان کے تسلیم کرلیتا ہے پس اگر یہ بات مان لیجائے کہ خیالات مذکورہ مذہبی تعلیمات کے سبب دنیا میں شائع ہوئے تو بھی ہمارا مطلب کہیں نہیں جاتا کیونکہ اگر یہ دونوں اصول یعنی مبدا و معاد مجملاً انسان کی فطرت میں مخفی نہ ہوتے تو کسی طرح ممکن نہ تھا کہ سارا جہان ایسی دو نادیدہ باتوں کے تسلیم کرنے پر متفق ہو جاتا جن کا نمونہ سلسلہ محسوسات میں کہیں نظر نہیں آتا۔

ہم اوپر یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ قدرتی علم میں اکتسابی علم کی طرح غلطی اور خطا کا احتمال کبھی نہیں ہوتا بلکہ وہ ہمیشہ سچا اور مطابق واقع کے ہوتا ہے پس جبکہ ہم یہ بات ثابت کر چکے کہ مبدا و معاد کا اجمالی علم قدرتی ہے اکتسابی نہیں ہے تو ضرور ہے کہ جیسا مبدا و معاد کی نسبت ہمارا اعتقاد ہے اسی طرح واقع میں بھی کوئی ہمارا صانع ہے اور مرنے کے بعد ہماری

بُرائی بھلائی کا ثمرہ ہم کو ملنے والا ہے؛ اور جب یہ بات ثابت ہو چکی کہ مبدا و معاد کا اعتقاد صحیح اور مطابق واقع کے ہے تو ہماری عقل ہرگز جائز نہیں رکھتی کہ جس فیاض حکیم نے بغیر طلب اور خواہش کے اس اجمالی علم کی چاٹ لگا کر ہم کو اُس کی تفصیل کا مشتاق بلکہ ایسا حاجتمند کیا؛ جیسے بیمار دوا کا اور پیاسا پانی کا محتاج ہوتا ہے وہ باوجود ہماری طلب اور خواہش کے اُس کی تفصیل کا دروازہ ہم پر نہ کھولے ہمارے نزدیک اگر مبدا د معاد کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے وسائل ہم سے منقطع کئے جائیں تو ہمارا حال یا تو بعینہٖ اُس پیاسے کا سا ہو جس کو ایک سرد اور شیریں اور شفاف پانی کے چشمہ سے دو گھونٹ پلا کر اُس چشمہ کی راہیں چاروں طرف سے مسدود کردیں یا اُس غلام کا سا حال ہو جس کو اُس کا آقا کسی دور و دراز مسافت پر ایک خطرناک رستہ سے بھیجے اور سوا اسکے کہ اُس رستہ کا خطرناک ہونا اُس کو کسی طرح جتا دے اُن خطرات کی حقیقت یا اُنکے موقع و محل سے آگاہ نہ کرے اور کوئی تدبیر اُن سے بچنے کی اُس کو نہ سوجھائے۔ کیا ہمارا ولی نعمت جس کو ہم جود و کرم کے ساتھ متصف اور بخل و خست سے منزہ جانتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کرسکتا ہے نہیں ہرگز نہیں کرسکتا بلکہ ضرور ہے کہ وہ ہمارے لئے کوئی ایسی شمع روشن کرے جو اس اجمال کے دھندلکے پر تفصیل کی روشنی پھیلا کر ہمارے جہل و تردد کو علم و یقین کے ساتھ مبدل کردے۔

یہاں شاید ہمارے دل میں یہ خیال گذرے کہ وہ شمع ممکن ہے کہ

ہماری عقل ہو جو کہ ہم میں اور ہمارے ابنائے جنس یعنی اور حیوانات میں ما بہ الامتیاز ہے اور جسکے سبب سے ہم کو تمام محسوسات پر شرف اور فضیلت حاصل ہے اور جس کی بدولت ہمارے بنی نوع پر موجودات عالم کے اسرار روز بروز کھلتے چلے جاتے ہیں مگر ہم کو اُمید نہیں کہ اس خیال کو ہمارے دل میں پانی کے بُلبلہ سے زیادہ قیام ہو کیونکہ ہم جو اپنے گریبان میں مُنہ ڈالکر دیکھتے ہیں تو اپنی عقل کو مبدا و معاد کی حقیقت کے ساتھ وہ نسبت پاتے ہیں جو آنکھوں والے کو ایک اندھیری کوٹھری کے ساتھ ہوتی ہے کیا کسی کو یہ اُمید ہے کہ آنکھوں کی روشنی ایک کلبہ تیرہ و تار میں کچھ کام دے سکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں دے سکتی۔ اسی طرح آدمی کی عقل مبدا و معاد کی حقیقت کا سراغ ہرگز نہیں لگا سکتی۔ بڑے بڑے حکیم اور فیلسوف اور بڑے بڑے محقق دانشمند جنہوں نے سارے جہان کی چیزوں کو چھان مارا اور حقایق اشیاء پر جو جہالت کے پردے پڑے ہوئے تھے اُن کو مرتفع کیا اور قانون قدرت سے وہ اصول اور وہ قاعدے استنباط کئے جنکے سبب سے انسان کے چہرہ پر خلافت رحمانی کا منصب ادا ہونا کھل گیا جب اُنہوں نے قدم اپنی حد سے آگے بڑھایا یعنی بے اسکے کہ کسی شمع سے اپنا چراغ روشن کریں اپنی اٹکل سے مبدا و معاد کا سُراغ ڈھونڈنے لگے تو صرف یہی نہیں کہ وہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے بلکہ اُنھوں نے ایسی ٹھوکریں کھائیں اور اُن کی رایوں نے ایسی غلطیاں کیں کہ جب اُنکے اور مقالات کے ساتھ اُن رایوں کو دیکھا جاتا ہے تو اُن میں وہ نسبت معلوم ہوتی

ہے جوکہ عاقل اور مجنوں کے کلام میں ہونی چاہیئے اور بڑی دلیل اس بات کی کہ یہ گروہ اپنی سعی میں ناکام رہا یہ ہے کہ اُس بے شمار گروہ میں سے شاید دو شخصوں کی رائیں ایسی نہ نکلیں جو کہ باہم اتحاد کلی رکھتے ہوں یہاں ہم کو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مطلب کے زیادہ تر دلنشین کرنے کے لئے قدیم مصر والوں کا تھوڑا سا ضروری حال رولن صاحب کی تاریخ سے بطور انتخاب کے نقل کیا جائے۔

جس طرح اس زمانہ میں اہل یورپ اپنے تئیں پورا شایستہ اور اپنے ماسوا تمام عالم کو وحشی یا نیم وحشی خیال کرتے ہیں اسی طرح "اہل مصر غیر ملکوں کے لوگوں کو وحشی کہا کرتے تھے چنانچہ جب نکیر بادشاہ تخت پہ بیٹھا تو اُس نے اول دریائے نیل کی نہر پہ بدستور سابق مدد جاری رکھی مگر پھر ایک غیبی فال سے خوف کھا کر اُس نہر کا بنوانا چھوڑ دیا کیونکہ اُس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ اس نہر کے بننے سے وحشی قوموں کے لئے مصر میں آنیکی راہ کھل جائیگی۔ پہلے لوگ مصر کو فنون و آداب سلطنت کا ایک عمدہ مدرسہ جہاں سے علوم کو نشو و نما اور روز بروز ترقی ہوتی سمجھتے تھے اور حقیقت میں بھی عمدہ عمدہ فن وہاں ایجاد ہوتے تھے اور اس ملک سے نہایت عمدہ عمدہ ہنر اور عجیب عجیب فن اُن لوگوں کو جو علم و ہنر میں ترقی کرنیکی کوشش کرتے تھے حاصل ہوتے تھے یونان کے بڑے بڑے لوگوں نے مثل ہومر اور فیثاغورس اور افلاطون اور وہاں کے اچھے اچھے مقننوں نے مثل لائیکرگس اور سولن کے اور بہت سے نامیوں نے جن کا بیان یہاں ضروری نہیں بنظر تکمیل علوم مصر کا سفر اختیار کیا تھا

اور خدا تعالیٰ نے بھی (کتاب مقدس میں) اُس کی تعریف کی ہے۔ کیونکہ اُس نے
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں یہ فرمایا تھا کہ وہ مصریوں کے ہر طرح
کے علم و ہنر میں کامل تھا۔ مصری ایک عجیب طرح کی موجد طبیعت رکھتے تھے
اور ہر کام میں نئے نئے ایجاد نکالتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی طبیعت کو مفید
کاموں کے ایجاد کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اور اُنکے زمانہ کے علماء نے جو کہ
مصر کے مایہ تھے مصر کو عجیب عجیب ایجادوں سے معمور کر دیا تھا۔ اُنھوں
نے کسی ایسی چیز سے جس سے طبیعت انسانی کی تکمیل ہوتی ہے یا جس سے
آرام اور خوشی حاصل ہوتی ہے مصر کو محروم نہ رکھا تھا۔ ستاروں کی حرکات
پر وہ لوگ سب سے پہلے مطلع ہوئے اور سب سے پہلے اُنھوں نے ہی علم
ہندسہ ایجاد کیا۔ موجودات عالم کے حالات اور خواص دریافت کرنے
میں یہ لوگ بہت کوشش کرتے تھے۔ مصریوں نے فن عمارت اور رنگ آمیزی
اور سنگ تراشی اور اور تمام فنون کو کمال پر پہونچایا تھا جن لوگوں نے
قواعد حکمت و حکومت کو خوب سمجھا اُن میں سب سے اول مصری تھے۔ اس
قوم نے یہ بات سب سے پہلے دریافت کی کہ فنون قواعد سلطنت کا اصلی مطلب
یہ ہے کہ اپنی زندگی مزے سے کٹے اور رعیت آباد رہے۔ مگر دین کے مقدمات
میں جس قدر مصری احمق تھے کوئی نہ تھا۔ بتوں کی بہت کثرت تھی اور اُنکے
غول اور اُنکے درجے جدا جدا تھے ان بتوں میں اوسرس اور اسس جن کو
وہ چاند سورج تصور کرتے تھے بہت بڑے بت تھے اُن کی پرستش عموماً
ہوتی تھی اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ انہیں سیاروں کی پرستش سے بت پرستی

نے ظہور پایا۔ اُنکے سوا بیل اور کتّا اور بھیڑ اور بلّی اور باز اور مگرمچھ اور
لگ لگ کی بھی پرستش ہوتی تھی اور ان میں سے بعض جانور ایسے تھے کہ
خاص خاص شہروں میں پوجے جاتے تھے اور یہ نقشہ تھا کہ ایک قوم ایک جانور کو
قبلہ وکعبہ سمجھکر دیوتا کی طرح پوجتی تھی اور دوسری قوم اُسی کی صورت سے نفرت
کرتی تھی ان جانوروں میں سانڈ ایپس نہایت ممتاز ہوتا تھا اُسکے نام کے
بڑے بڑے عالیشان مندر بنائے جاتے تھے اُسکے مرجانیکے بعد بہ نسبت اُسکے
ایام حیات کے اُس کی عزت اور توقیر زیادہ ہوتی تھی۔ تمام مصر اُسکے سوگ
میں ماتم کرتا تھا اور اُسکی تجہیز وتکفین اس دھوم دھام سے ہوتی تھی کہ
اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ ٹولیمی لیگس کی بادشاہت میں جب وہ
جانور ضعیف ہوکر مرا تو اُسکے ساز وسامان میں سوائے اخراجات معمولی
کے ایک لاکھ بارہ ہزار پانسو روپیہ صرف ہوا تھا۔ جب اُسکی تجہیز وتکفین سے
فراغت ہوتی تھی تو اُس کی جگہ دوسرے کے مقرر کرنیکی فکر ہوتی تھی۔ اور تمام
مصر اُس کی تلاش میں جاتا تھا اس سانڈ میں چند علامتیں ہونی ضرور تھیں
جن کے سبب وہ اَور سانڈوں سے ممتاز ہوتا۔ پیشانی پر ہلال کی شکل
پشت پر عقاب کی صورت زبان پر بھونری کا نقشہ ہونا ضرور تھا اور جب
قسمت سے ایسا سانڈ ہاتھ آجاتا تھا تو تمام مصر میں گھر گھر خوشی ہوتی تھی
اور ماتم جاتا رہتا تھا۔ جب شاہ کمبیس۔ اتھوپیا کی مہم سے ناکام آیا تو
وہ ایسے دنوں میں مصر پر گذرا کہ مصری سانڈ ایپس کی خوشیوں میں کھیل کود
رہے تھے۔ یہ ناکام دلسوختہ اُن کو خوشیاں کرتے دیکھکر یہ سمجھا کہ یہ

لوگ میری ناکامی پر ہنستے ہیں۔ اُس نے اُس نئے سانڈ کو جس نے اپنی خدائی کا
لطف بہت کم اُٹھایا تھا قتل کرا دیا اور تمام مصریوں کو بن خدا کا کر دیا
مصریوں نے صرف جانوروں کے آگے خوشبوئیں جلانے پر ہی اکتفا نہ کیا
تھا بلکہ اپنے باغوں کے نباتات کو بھی دیوتا سمجھتے تھے۔ نہایت تعجب کی بات
ہے کہ جو لوگ تمام دنیا سے فضل و ہنر میں فائق ہوں اور وہ آپ کو ایسا
ہی سمجھتے بھی ہوں وہ ایسی حماقت میں گرفتار ہو جائیں اور جھوٹے
معبودوں کی پرستش میں ایسے اندھا دھند پڑ جائیں کہ تھوڑی سی سمجھ والا
بھی اُس کو پسند نہ کرے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا مندروں میں
پوجنا اور کمال احتیاط سے اُن کو پالنا اور اُن کے قاتلوں سے قصاص
لینا اور مرنے کے بعد اُن جانوروں کو عطریات سے بھرنا اور بڑی دھوم
دھام سے قبروں میں دفنانا اور رفتہ رفتہ پیاز اور لہسن کو بھی پوجنا اور
اڑے وقتوں میں اُن سے مدد مانگنی اور اُن پر بھروسا کرنا ایسی نادانی
کی باتیں ہیں کہ اس زمانہ میں اُن پر مشکل سے یقین آتا ہے مگر اگلے لوگ
ان سب باتوں پر گواہی دیتے چلے آئے ہیں۔ لوشین صاحب لکھتے ہیں کہ
اگر تم کسی ایسے عالیشان مندر میں جاؤ جو سونے چاندی سے جگمگا رہا
ہو اور چاند سورج اُس کی ٹیپ ٹاپ کی تاب نہ لا سکیں تو تم کو اُس
مندر کے دیوتا کے دیکھنے کا بہت شوق ہوگا اور تم نہایت مشتاق ہو کر جب
اندر جاؤ گے تو دیکھو گے الگ تھلگ یا بلی یا بندر بڑی شان و شوکت اور تمام کروفر
سے وہاں جلوہ فرما ہے یا خدا تعالیٰ نے بے شک اس بات کے دکھانے کو کہ

انسان اگر اپنی عقل پر چھوڑ دیا جائے تو اُسکا یہ روپ ہو جاتا ہے
کہ اہل مصر جیسے لوگوں کو جنھوں نے عقل انسانی کو نہایت اعلےٰ درجہ تک
پہونچا دیا تھا ایسی نفرت انگیز اور بیہودہ بت پرستی میں پھنسا رہنے دیا
تاکہ لوگوں کی تماشاگاہ بنیں"

مصریوں کا یہ عبرت انگیز حال جو برولن صاحب کی تاریخ سے نقل کیا گیا
تو اہل یونان کا حال بھی اس کے قریب قریب تھا اور یہ اس بات کا
نہایت کامل ثبوت ہے کہ انسان کی عقل معاش کیسی ہی اعلےٰ درجہ تک
کیوں نہ پہنچ جائے مبدا و معاد کا علم حاصل کرنے میں ہرگز کافی نہیں
ہوسکتی۔ تاریخ یونان میں لکھا ہے کہ جب ہائیرو بادشاہ سسلی نے
حکیم سائیمونیڈیز سے باری تعالیٰ کی حقیقت دریافت کی تو
اُس نے پہلے دن ایک روز کی اور دوسرے دن دو روز کی مہلت
چاہی اور اسی طرح ہر روز مہلت مانگتا رہا آخر ایک دن بادشاہ نے
بار بار مہلت مانگنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ یہ مضمون سمجھ اور
فکر سے اس قدر بعید ہے کہ جس قدر اس میں غور کرتا ہوں اُسی قدر
تحیر زیادہ ہوتا ہے اور تاریکی چھائی جاتی ہے اور کنفیوشیس جو حکماے
چین کا سرگردہ اور اہل چین کا مقتدا ہے اور جس کی تعلیمات کا مدار
محض عقل ورائے پر ہے جب اُس سے لوگوں نے آخرت کا حال پوچھا
تو اُس نے اُن کا جواب دینے میں اپنی کمال دانائی اور انصاف
ظاہر کیا اُس نے کہا کہ جب دنیا ہی کی ہزاروں چیزیں ہماری نظر سے

مخفی ہیں تو وہاں تک ہماری عقل کیونکر پہنچ سکتی ہے۔
بہرحال اگر ہماری اس رائے سے جو اوپر بیان کی گئی یا کسی اور دلیل سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ واقع میں کوئی ہمارا صانع ہے اور مرنے کے بعد ہم کو اپنی بُرائی بھلائی کا ثمرہ ضرور ملنے والا ہے تو بیشک ہم کو ان دونوں باتوں کا تفصیلی علم حاصل کرنے کے لئے اپنی عقل ناقص کے سوا کوئی اور ذریعہ ڈھونڈنا پڑیگا اور وہ ذریعہ نہیں ہے مگر وجود صاحب الہام والحمد للہ علی الاتمام